اقبال
نقش ہائے رنگ رنگ

ڈاکٹر تسکینہ فاضل

فاضل پبلی کیشنز سری نگر کشمیر

اقبال

نقش ہائے رنگ رنگ

کتب خانہ
داخلہ نمبر 40146

ڈاکٹر تسکینہ فاضل

فاضل پبلی کیشنز سری نگر کشمیر

جملہ حقوق محفوظ

۲۰۰۴ء

کتاب کا نام	:	اقبال۔ نقش ہائے رنگ رنگ
مصنفہ	:	ڈاکٹر تسکینہ فاضل
کمپوزنگ	:	ضمیر احمد
تعداد	:	پانچ سو
صفحات	:	۲۱۰
قیمت	:	دوسو پچاس روپے
مطبع	:	جے۔ کے۔ آفسیٹ پریس، دہلی

اپنے

خضرِ راہ

پروفیسر آل احمد سرورؔ (مرحوم)

کے نام

نام نیکِ رفتگاں ضائع مکن

تابماند نامِ نیکت برقرار

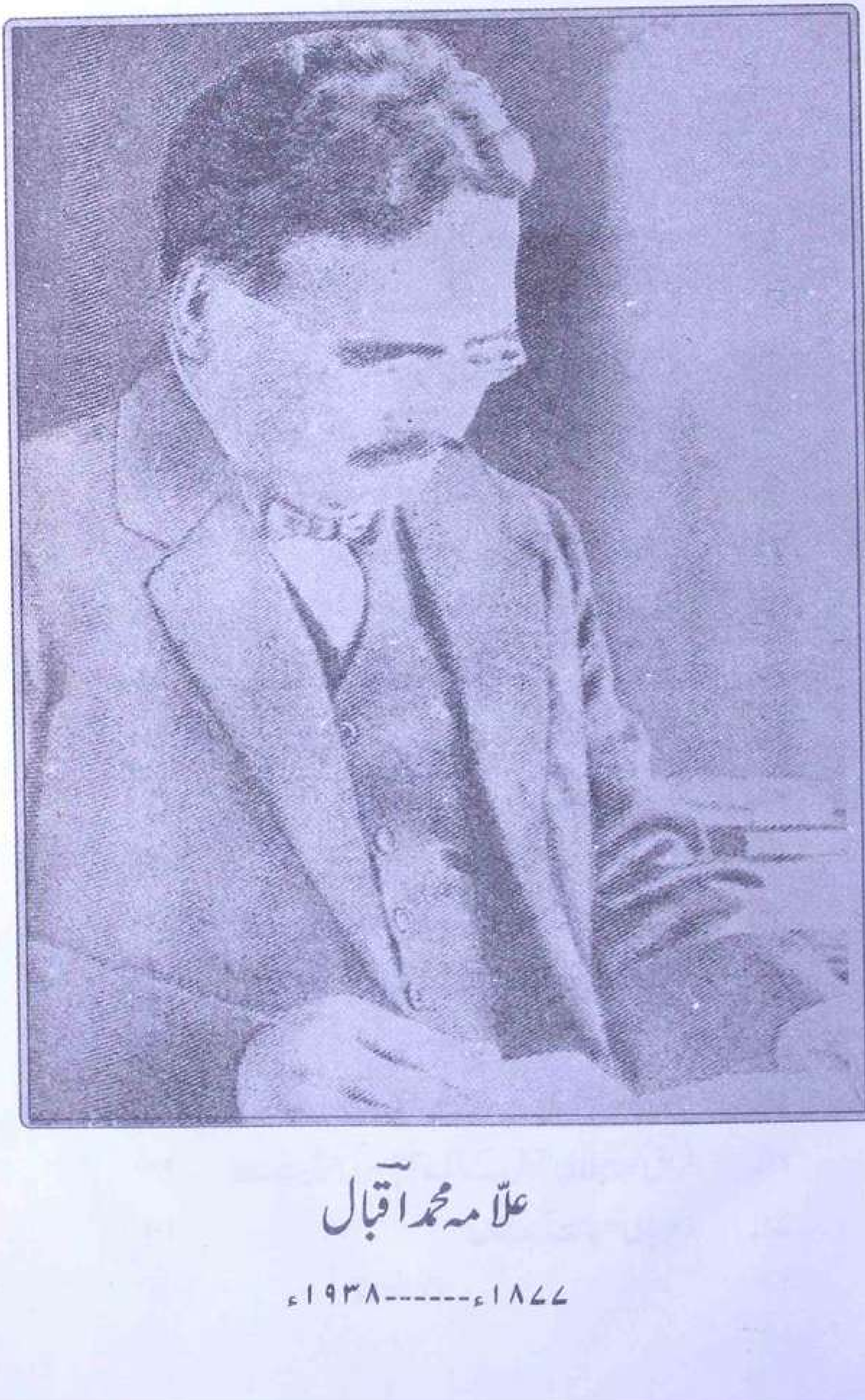

علّامہ محمد اقبال

۱۸۷۷ء------۱۹۳۸ء

ترتیب

☆☆☆

۱۔	اقبال اور اُن کے معاصر شعراء اور ادباء	۱
۲۔	اقبال انسٹی ٹیوٹ کی چند مطبوعات کا جائزہ	۱۸
۳۔	فاضل کاشمیری کی شاعری پر اقبال کے اثرات	۳۷
۴۔	پروفیسر یوسف سلیم چشتی بحیثیت شارحِ اقبال	۴۹
۵۔	زخاک خویش طلب آتشے کہ پیدا نیست۔ایک مطالعہ	۶۶
۶۔	بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل	۷۳
۷۔	بانگِ درا میں مشاہیر پر اقبال کی نظمیں	۷۸
۸۔	حضورؐ کا نظریۂ شعر اور اقبال اسرارِ خودی کی روشنی میں	۹۲
۹۔	مثنوی اسرارِ خودی پر ایک نظر	۱۰۲
۱۰۔	جاوید نامہ کی روشنی میں اقبال کا تصورِ ابلیس	۱۲۱
۱۱۔	اقبال اور قرآنی تلمیحات	۱۲۸
۱۲۔	اقبال کی اُردو شاعری کا استعاراتی مطالعہ	۱۴۰
۱۳۔	شیخ غلام قادر گرامی اور علامہ اقبال	۱۵۲
۱۴۔	اسد ملتانی۔اقبال کے ایک ہم عصر	۱۶۳
۱۵۔	مثنوی اسرارِ خودی کے دو ترجمے: ایک مطالعہ	۱۷۵
۱۶۔	فراق گورکھپوری اقبال کے ایک ہم عصر کی حیثیت سے	۱۸۹
۱۷۔	زیرپای اُمہات آمد جناں	۲۰۱

☆☆☆

حرفِ آغاز

اقبال ایک عظیم شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم مفکر بھی ہیں۔ اُن کا شمار دنیا کے اُن عظیم شعراء میں ہوتا ہے جن کے یہاں شاعری اور فلسفے کا نہایت حسین امتزاج ملتا ہے۔ جانکاہی اور کرب آگیں مراحل سے گزرنے کے عمل نے اُن کے کارناموں کو دوام بخشا ہے۔ واقعتاً اُن کی شاعری اُن کے خونِ جگر کی نمود ہے۔ اُنہوں نے بنی نوع انسان کو بالعموم اور ملت اسلامیہ کو بالخصوص اپنے حیات بخش پیغام سے نوازا۔ بعض کوتاہ اندیشوں نے اُن کے مسلمانوں سے خطاب کی بناء پر اُنہیں ایک مخصوص فرقے کا شاعر قرار دیکر اُن کی فکر کے کینوس کو محدود کردینے کی سعی لاحاصل کی۔ واضح رہے اقبال نے اسلام کی اصطلاح کو نہایت وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے۔ یہی وہ دینِ کامل ہے جس میں تمام بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کا راز مضمر ہے۔ اس میں کسی مخصوص فرقے، قوم یا رنگ و نسل کی تخصیص کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اقبال کا پیغام آفاقی ہے۔ اُن پر لکھنے کا آغاز اُن کی حیات میں ہی ہوا تھا یہ سلسلہ آج بھی برابر جاری ہے اور اس کے مستقبل میں بھی جاری رہنے کے قوی اور روشن امکانات ہیں۔

اقبال ایک ایسے مفکر شاعر ہیں جن کی تعین قدر کے لئے اسلامی نظام فکر کے علاوہ دوسرے کئی نظام ہائے افکار کا گہرا مطالعہ ناگزیر ہے۔ قرآن حکیم کو اُن کے مرکزی اور اساسی سرچشمۂ فکر کی حیثیت حاصل ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور مرحوم نے اقبال کو اسلامی ہندی اور مغربی فکر کا شاعر قرار دیا ہے۔ تفہیم اقبال کا حق اُس وقت تک ادا نہیں ہوسکتا جب تک نہ قدیم و جدید فلسفوں کا مطالعہ کیا جائے۔ سقراط اور افلاطون جیسے اکابر مفکرین یونان

سے اُنہوں نے خاصا استفادہ کیا ہے۔ اُنہوں نے افلاطون پر تنقید بھی کی ہے۔ مغرب کے مفکرین میں دانتے، گوئٹے، نطشے، کانٹ، شوپن ہار، برگسان، وہائٹ ہیڈ، ڈیکارٹ اور مارکس وغیرہ کا مطالعہ کئے بغیر بھی اُنہیں سمجھنا ممکن نہیں۔ اسی طرح سربرآوردہ اسلامی مفکرین، جن میں الجیلی، غزالی، رومی، سنائی، شیخ احمد سرہندی وغیرہ وغیرہ کے اسمائے گرامی شامل ہیں، کے افکار وخیالات نے بھی فکر اقبال کو گہرے طور پر متاثر کیا ہے۔ اقبال نے مشرق ومغرب کے ان تمام مفکرین کے اُنہیں افکار وخیالات سے استفادہ یا اثر قبول کیا ہے، جو اُن کے فکر کے بنیادی سرچشمے قرآن سے ہم آہنگ ہیں۔

اقبال فن برائے فن کے نہیں فن برائے زندگی کے قائل ہیں۔ اُن کے نزدیک فن زندگی کا خادم ہے۔ اس لئے اسے اعلیٰ اقدار کا حامل ہونا چاہیے۔ اُنہوں نے اپنے نظریات شعری کو اپنی شاعری میں بھی عملی طور پر برتنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔ اُن کے یہاں جلال وجمال بھی ہے، اُن کا لہجہ نہایت پرشکوہ ہے۔

پیش نظر کتاب کا نام انگریزی ادب کے عالم اور اقبال پر کئی عمدہ کتابوں کے مصنف جناب پروفیسر غلام رسول ملک نے تجویز فرمایا ہے۔ میں پروفیسر موصوف کی تہہ دل سے شکر گذار ہوں۔ یہ کتاب میرے اُن مضامین پر مشتمل ہے جو گزشتہ دس بارہ برسوں کے دوران مختلف اوقات میں تحریر کئے گئے ہیں۔ ان میں بعض ایسے مضامین بھی شامل ہیں جو اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی کے زیر اہتمام منعقد کئے گئے سمیناروں کے لئے مختلف اوقات میں لکھے اور پھر پڑھے گئے ہیں۔ جیسے حضورؐ کا نظریۂ شعر اور اقبال اسرارِ خودی کی روشنی میں، مثنوی اسرارِ خودی۔ ایک مطالعہ، پروفیسر یوسف سلیم چشتی بحیثیت شارح اقبال، اقبال کی شاعری میں قرآنی تلمیحات، اقبال کی شاعری کا استعاراتی نظام اور اقبال انسٹی ٹیوٹ کی چند مطبوعات کا جائزہ۔ کتاب میں شامل اکثر مقالات مختلف رسائل میں شائع ہوتے

رہے ہیں۔ اس لئے ان میں کہیں کہیں تکرار بھی ملے گی۔ چند ایسے مضامین بھی شامل کتاب ہیں جن کی تاحال کہیں اشاعت نہیں ہوئی ہے۔ ان کے عنوانات یہ ہیں۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ کی چند مطبوعات کا جائزہ۔ فاضل کاشمیری کی شاعری پر اقبال کے اثرات، مثنوی اسرارِ خودی کے دو ترجمے۔ ایک مطالعہ، اسد ملتانی۔ اقبال کے ایک ہم عصر۔ اوّل الذکر مضمون کو ایک کتاب کے مختصر سے باب کی حیثیت سے قبول کیا جائے۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی نے سال رواں کی ۱۷ اور ۱۸ اکتوبر کو اقبالیات کے گزشتہ دس سال کے موضوع پر ایک قومی سمینار کا انعقاد کیا تھا، اسی حوالے سے میرے ذہن میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کے گزشتہ دس سالہ ادب کا ایک خاکہ ہے۔ میں اس موضوع پر ایک کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ یہ نہایت ہی وسیع موضوع ہے۔ اس میں گزشتہ دہائی یعنی ۱۹۹۳ء سے ۲۰۰۲ء تک ادارہ کے اہتمام سے شائع ہونے والی تمام مطبوعات کا ایک جائزہ لیا جائے گا۔ حالات نے مساعدت کی تو انشاء اللہ اس پر عنقریب کام شروع کیا جائے گا۔ زیرِ نظر کتاب میں شامل اکثر مضامین سے متعلق میرا ہرگز یہ دعویٰ نہیں کہ یہ تمام موضوعات اچھوتے ہیں۔ ان پر پہلے بھی لکھا جا چکا ہے تاہم ہر لکھنے والے کا اپنا ایک مخصوص اور منفرد اندازِ نظر ہوتا ہے اور ادب میں کوئی بات حتمی نہیں ہو سکتی۔ بعض اوقات اشارہ استیعاب کا باعث ہوتا ہے۔ ان مضامین میں اقبال کی شاعری کے بعض اہم پہلوؤں پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ ان سے اگر اقبال کو سمجھنے میں کسی حد تک مدد مل سکے تو میں سمجھوں گی کہ میری یہ کوشش بار آور ثابت ہوئی۔

تسکینہ فاضل

اقبال اور اُن کے معاصر شعراء اور اُدباء

ایک عظیم فن کار کی شناخت یہ ہے کہ اُس کا فکر وفن زمان ومکان کی حدود وقیود، مذہب وملّت اور رنگ ونسل کے امتیاز سے بالاتر ہوتا ہے، وہ اپنی ذات کو بنی نوع انسان کی فلاح وبہبود کے لئے وقف کر دیتا ہے، چنانچہ اس قبیل کی شخصیتیں عالمگیر سطح پر قبولِ عام حاصل کر لیتی ہیں۔ حکیم الامّت علاّمہ محمد اقبال کا شمار بھی ایسی ہی شخصیات میں ہوتا ہے۔ ان کا فکر وفن تدریجی ارتقاء کے مراحل سے گذر کر بنی نوع انسان کا احاطہ کر کے عالمگیر شہرت کا حامل ہے۔ اُنہیں ہر عہد کی محبوب ومرغوب اور محترم شخصیت ہونے کا اعزاز حاصل رہے گا۔ اُن کے افکار وخیالات میں جو وسعت، گہرائی، تنوّع، تحرّک، توانائی، انسان دوستی، خلوص اور دردمندی کا جذبہ کارفرما ہے، اُس نے نہ صرف اُن کے اپنے دور کو متاثر کیا بلکہ اس میں ہر دور کو برابر متاثر کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ چنانچہ وہ اپنی حیات ہی میں اہلِ دانش اور ارباب فکر ونظر کے یہاں توجّہ کا مرکز بن گئے تھے، اُن پر لکھنے کا سلسلہ جب سے آج تک برابر جاری ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گا

دولتِ جاوید یافت ہر کہ نکو نام زیست کز عقبش ذکرِ خیر زندہ کند نام را

جہاں تک اقبال کے معاصر شعراء اور ادباء کا تعلق ہے۔ ان کی ایک اچھی خاصی تعداد ہے، ان میں اُن کے بزرگ، ہم عمر اور جونیئر معاصرین شامل ہیں۔ اپنے بزرگ معاصرین کے مقابلے میں وہ عمر کے اعتبار سے جونیئر ضرور تھے تاہم ان کے یہاں بتدریج ارتقاء کے نتیجے میں فکر کی جو گہرائی، وسعت، تنوّع اور پختگی پیدا ہوتی گئی اس کا اعتراف ان کے بزرگ معاصر شعراء اور ادباء نے نہایت افتخار کے ساتھ کیا ہے، ان کے سینیر اور جونیئر معاصرین

نے اُن کی حیات، شخصیت اور کارناموں کے پیشِ نظر اپنے اس نابغۂ روزگار ہمعصر کو شاندار خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ اقبالؔ کے بزرگ معاصر شعراء اور ادباء میں لسان العصر اکبرؔ الہ آبادی، شیخ غلام قادر گرامیؔ، مولانا وحید الدین سلیمؔ، صفی لکھنوی، نادرؔ کاکوروی، احمد حسینؔ خان، چودھری خوشی محمد ناظرؔ، مولانا ظفر علی خان، شیخ عبدالقادر، میر غلام بھیک نیرنگؔ جیسے مشاہیر کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

اقبال اپنے بزرگ ہم عصر شاعر لسان العصر اکبرؔ الہ آبادی کے بے حد مدّاح تھے۔ وہ اُنہیں اپنا پیر و مرشد مانتے تھے۔ اقبالؔ کے نزدیک کسی شاعر کا تتبع کرنا اُسے خراجِ عقیدت پیش کرنے کا ایک انداز یا طریقہ ہے۔ چنانچہ اکبرؔ کے رنگ میں کہے گئے اقبال کے طنزیہ اور مزاحیہ اشعار کو (جو اکبری اقبال کے نام سے مشہور ہیں) موصوف کے تئیں خراجِ عقیدت پیش کرنے کا ایک انداز ہی سمجھ لینا چاہیے۔ کیونکہ کسی شاعر کے رنگ میں شعر کہنا اُس کی فوقیت کا اعتراف کرنا ہے۔ اقبالؔ اور اکبر دونوں معاصرین کے باہمی تعلقات تاحیات خوشگوار رہے لیکن جب اقبالؔ نے فارسی مثنوی ''اسرارِ خودی'' میں خواجہ حافظ شیرازی، جنہیں لسان الغیب کی حیثیت حاصل تھی، کی شاعری سے برآمد ہونے والے نتائج کو مضر قرار دیا اور تصوّف پر اپنے بصیرت افروز اور اجتہادی خیالات کا اظہار کیا تو نہ صرف صوفیاء کا حلقہ بلکہ خود اُن کے اپنے قریبی احباب، جن میں اکبر الہ آبادی بھی شامل تھے، سخت برہم ہوئے، تاہم اکبرؔ کی طرف سے مثنوی پر اعتراض کے جواب میں اقبالؔ نے اُنہیں اس کا غائر مطالعہ کرنے کی درخواست کرتے ہوئے ان الفاظ میں شکوہ کیا:

> ''جس طرح منصور کو شبلی کے پتھر سے زخم آیا اور اس کی تکلیف سے اُس نے آہ و فریاد کی، اُسی طرح مجھ کو بھی آپ کا اعتراض تکلیف دیتا ہے۔''

اقبال اور ان کے دوست خواجہ حسن نظامی کے بیچ مثنوی میں تصوّف کے موضوع پر خاصی بحث چل نکلی، خواجہ حسن نظامی، جن کے متعلق مشہور ہے کہ انہوں نے اقبالؔ کی مخالفت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کیا اور مثنوی ''اسرارِ خودی'' پر نہ صرف خود مخالفانہ

مضامین لکھے بلکہ اوروں سے بھی لکھوائے۔ اکبر نے اس معرکہ میں ثالثِ بالخیر کا رول ادا کرتے ہوئے خواجہ صاحب سے باز رہنے کے لئے اپنی تمامتر کوششیں بروئے کار لائیں، وہ ہرگز یہ نہیں چاہتے تھے کہ اقبال کی امیج کو کوئی ٹھیس پہنچے، اس ضمن میں اقبال نے بھی حقیقت حال کی وضاحت کے لئے اپنے احباب کے نام خطوط تحریر کئے اور اس سلسلہ میں اُن کی چند تحریریں بھی سامنے آئیں۔ کیونکہ اُنہیں خدشہ تھا کہ ان مخالفانہ مضامین کا اثر اچھا نہ ہوگا۔ اکبر نے خواجہ حسن نظامی کے نام ۲۱، جنوری ۱۹۱۶ء کو ایک خط تحریر کیا جس میں مندرجہ ذیل اشعار لکھ کر بھیجے

حضرت اقبال اور خواجہ حسن پہلوانی اُن میں، ان میں بانکپن
جب نہیں ہے زور شاہی کے لئے آؤ گتھ جائیں خدا ہی کے لئے
ورزشوں میں کچھ تکلف ہی سہی ہاتھا پائی کو تصوّف ہی سہی
ہست در ہر گوشۂ ویرانہ رقص می کند دیوانہ با دیوانہ رقص[1]

اکبر اور اقبال دونوں معاصرین کی آپس میں خط و کتابت بھی رہی ہے۔ ان خطوط کے مطالعے سے دونوں کے باہمی تعلقات کی نوعیت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ ان میں شعر و شاعری کے رموز و نکات اور بعض نجی معاملات بھی زیرِ بحث آئے ہیں۔ اقبال اکبر کے کلام میں طنز و ظرافت کے پس پردہ اُن کی غیر معمولی شعری حسیت کے قائل تھے۔ اُن کے نزدیک اُن کی ظرافت کے پس پشت اُن کے آنسو کارفرما ہیں۔ اور ان آنسوؤں کے اسباب پر اُن کی گہری نظر تھی۔ اُنہوں نے اپنے ایک انگریزی خطبہ "Muslim Community -a Sociological Study" میں اکبر کا ذکر نہایت شاندار الفاظ میں کیا ہے۔ یہ خطبہ انہوں نے اسٹریچی ہال ایم۔اے۔او کالج علی گڈھ میں دیا تھا اور مولانا ظفر علی خان نے اس کا ترجمہ ''ملّت بیضا پر ایک عمرانی نظر'' کے عنوان سے کیا تھا۔ یہ ترجمہ مارچ، اپریل ۱۹۱۱ء کے ''پنجاب ریویو'' میں شائع ہوا تھا۔ اکبر اور اقبال دونوں مشاہیر کی ایک دوسرے سے

۱۔ یہ اشعار ''خطوطِ اکبر بنام خواجہ حسن نظامی'' میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

ملاقاتیں بھی ہوتی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کے دُکھ سکھ میں شریک ہوتے تھے۔ دونوں کے درمیان تحائف کا تبادلہ بھی ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ اکبر نے الہ آباد سے اقبال کو لنگڑا آم تحفے میں بھیجا (اقبال آموں کے بے حد شوقین تھے) تو اقبال نے یہ شعر کہا ؎

اثر یہ تیرے اعجاز مسیحائی کا ہے اکبر — الہ آباد سے لنگڑا چلا، لاہور تک پہنچا

اقبال کو اکبر کا یہ شعر بہت پسند تھا ؎

جہاں ہستی ہوئی محدود لاکھوں پیچ پڑتے ہیں — عقیدے، عقل، عنصر، سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

اقبال کے نزدیک ہیگل کا فلسفہ اس شعر کی تفسیر ہے، یا پھر ہیگل کے سمندر کو اکبر نے ایک قطرے میں بند کر دیا ہے۔ چنانچہ اقبال نے اکبر سے اسی قسم کے اور اشعار کہنے کی گذارش کی تھی۔ ۹ نومبر ۱۹۰۴ء کو علامہ کی والدہ محترمہ امام بی بی کا انتقال ہو گیا تو اکبر نے تعزیت کے طور پر ایک نظم کہی جس میں اقبال کے والدین کے اوصاف کا ذکر کیا۔ نیز مرحومہ کا قطعۂ تاریخ بھی لکھا۔ ۱۹۲۱ء میں اکبر کا انتقال ہوا تو اقبال نے اپنے اس بزرگ ہم عصر اور پیر و مرشد کے انتقال پر ایک پُر درد مرثیہ لکھا اور اسے "پیامِ مشرق" کے پہلے ایڈیشن میں شائع کیا۔ اسے بعد کے ایڈیشنوں سے اس لئے خارج کر دیا گیا کیونکہ اس کی نوعیت شخصی اور ذاتی تھی جب کہ "پیام مشرق" کا موضوع مختلف تھا۔

فارسی زبان کے مسلّم الثبوت استاد مولانا شیخ غلام قادر گرامی کو اقبال وقتاً فوقتاً اپنے فارسی اشعار بھیج کر اُن کے تنقیدی خیالات کے منتظر رہتے تا کہ اُن سے استفادہ کیا جا سکے۔ گرامی اقبال کے اشعار پر جو رائے دیتے اقبال اُس سے کبھی اتفاق اور کبھی اختلاف ظاہر کرتے۔ دونوں کے درمیان شعر و شاعری کے رموز و نکات پر گفتگو کے پیش نظر ۱۹۲۵ء میں آگرہ سے نکلنے والے رسالہ "شمع" کے مدیر حسن عابد جعفری نے گرامی کی ایک فارسی غزل پر تعارفی نوٹ تحریر کرتے ہوئے مولانا سے اقبال کا رشتۂ تلمذ جوڑا تھا، جس پر علامہ نے اُسی وقت مدیر "شمع" کی یہ غلط فہمی رفع کر دی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ فن کے امام تھے۔ اس لئے دونوں کے درمیان اُستادی اور شاگردی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مولانا گرامی

اپنے کلام کو شائع کرنے کے معاملہ میں بے نیاز تھے، چنانچہ علاّمہ اقبالؔ نے اُن کی شعری صلاحیتوں اور اُن کے بلند مرتبے کے پیش نظر اُن سے اپنا کلام تھوڑا تھوڑا کر کے اُن کے پاس بغرض اشاعت بھیجنے کا مخلصانہ مشورہ دیا تھا۔ کیونکہ اقبالؔ گرامی کے کلام کو ایک بے بہا خزانہ تصوّر کر کے اِسے محفوظ کر دینے کے بے حد خواہاں تھے۔ اُنہیں گرامی سے بڑی عقیدت تھی جس کا اظہار اقبال نے اپنے احباب کے علاوہ مولانا کے نام تحریر کئے گئے خطوط میں کیا ہے۔ گرامی اور اقبالؔ انجمنِ حمایت اسلام لاہور کے کئی جلسوں میں شریک ہو کر اپنا کلام سنا چکے ہیں۔ ایک مرتبہ اقبالؔ نے اُنہیں مذکورہ انجمن کے سالانہ اجلاس میں شرکت کرنے پر اصرار کیا جب مولانا کے کلام سنانے کی باری آئی تو اقبالؔ نے اُن کا تعارف نہایت فخریہ کلمات میں کرایا۔ اُن کے نزدیک عرفیؔ اور نظیریؔ کے بعد اگر کوئی شاعر ہے تو وہ گرامیؔ ہے۔ اُنہوں نے کہا تھا "آج گرامی کو سن لو۔ کل فخر کرو گے کہ تم نے گرامیؔ کو دیکھا اور سنا ہے"۔ ایک مرتبہ مولانا گرامیؔ نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے ایک اجلاس میں چند رباعیاں سنائی تھیں جن سے اقبالؔ کی خداداد صلاحیت، عظمت، ہمہ گیر شہرت اور بے پناہ جذبۂ اخوت کی نسبت اُن کے جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ گرامیؔ کے ذوقِ شعر، اور شاعری پر اُن کی غیر معمولی دسترس، شہرت سے بے نیازی اور مخلص انسان ہونے کے باعث اقبالؔ کے اُن سے گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ اقبالؔ نے گرامیؔ کی رحلت پر ایک نہایت دردانگیز نظم کہی ہے۔ مولانا نے بھی اپنے اشعار میں اقبالؔ کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے۔

اقبالؔ اور صفیؔ لکھنوی دونوں اسلام کی سربلندی اور بقاء کے داعی تھے۔ بعض اوقات دونوں ہم عصر قومی جلسوں میں ایک ساتھ موجود ہوتے۔ ایک مرتبہ صفیؔ نے جلسے میں قومی ترانہ سنایا، اقبالؔ بھی جلسہ میں موجود تھے، اُنہوں نے صفیؔ کا قومی ترانہ بہت پسند کیا اور جب تک صفیؔ پڑھتے رہے، اقبالؔ تعظیماً سر جھکائے کھڑے رہے۔ قومی ترانہ یوں تھا۔

زندہ ہیں اگر زندہ، دنیا کو ہلا دیں گے — مشرق کا سر اُٹھ کر مغرب سے ملا دیں گے
دھارے میں زمانے کے بجلی کا خزانہ ہے — بہتے ہوئے پانی میں ہم آگ لگا دیں گے

ایران ہو یا ترکی دونوں کو مٹا دیکھیں　　کیا صفحۂ ہستی سے اسلام مٹا دیں گے
اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے　　اتنا ہی یہ اُبھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے

نادرؔ کاکوروی کے ساتھ غلام بھیک نیرنگ کا ذکر کرتے ہوئے اقبال نے دونوں کو اپنا ہم صفیر قرار دے کر تثلیث فی التوحید میں شامل کیا ہے۔ اُن کی ایک غزل منشی نوبت رائے نظر کے رسالہ ''خدنگِ نظر'' کے ۱۹۰۴ء کے اگست کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ جس کے مطلع اور مقطع دونوں میں نادرؔ کاکوروی کا ذکر کیا گیا ہے

پاس والوں کو تو آخر دیکھنا ہی تھا مجھے　　نادرؔ کاکوری نے دُور سے دیکھا مجھے
نادر و نیرنگ ہیں اقبالؔ میرے ہم صفیر　　ہے اسی تثلیث فی التوحید کا سودا مجھے

اقبالؔ اور خان احمد حسین خان دونوں معاصرین بعض اوقات کسی تقریب میں ایک ساتھ مدعو کئے جاتے۔ ایک مرتبہ دعوت میں طعام سے فارغ ہو کر شیخ عبدالقادر نے دونوں سے ایک غزل فی البدیہہ کہنے کی تجویز کی جس کی حاضرین نے تائید کی۔ مومن خان مومنؔ کا یہ مصرعہ، مصرعۂ طرح مقرر کیا گیا ؎

وعدۂ وصل سے ہو دل کو تسلی کیوں کر　　فکر یہ ہے کہ وہ وعدے سے پشیماں ہوگا

چودھری خوشی محمد ناظرؔ اور اقبالؔ دونوں انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسوں میں شرکت کر کے اپنا کلام سناتے تھے۔ ناظرؔ کے مجموعۂ کلام ''نغمۂ فردوس'' (جو دو حصّوں پر مشتمل ہے) کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُنہیں اقبالؔ سے گہری عقیدت تھی چنانچہ مثنوی ''ہیر و رانجھا'' میں عشاق کی بنائی ہوئی انجمن کا صدر اقبالؔ ہی کو مقرر کیا گیا ہے۔ ''نغمۂ فردوس'' میں درج بعض اشعار پر اقبالؔ کا رنگ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ناظرؔ نے رحلتِ اقبالؔ پر جو نظم لکھی ہے، اُس میں اُنہوں نے اپنے اس ہم عصر اور قوم کے نجمِ درخشاں کو شاندار خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

مشہور اخبار ''زمیندار'' کے مدیر مولانا ظفرؔ علی خان نے، جن کے بارے میں اقبال نے کہا ہے کہ اُن کے قلم میں مصطفےٰ کمال کی تلوار کا بانکپن ہے، قیام حیدرآباد کے زمانے میں

جب رسالہ ''مخزن'' میں اقبالؔ کا کلام دیکھا تو اُنہیں ایک خط تحریر کر کے اُن کی شعری صلاحیتوں کو سراہا۔ اقبالؔ نے بھی اُن کے خط کا جواب لکھا۔ اس طرح دونوں کے درمیان قلمی دوستی قائم ہوگئی۔ اس کے بعد ظفر علی خان لاہور آئے اور اقبالؔ سے انارکلی والے مکان میں ملاقات کی۔ یہ اقبالؔ کے شباب کا دور تھا۔ اس ملاقات میں اقبال مولانا سے بڑی بے تکلفی سے ملے اور مولانا کے لئے اُن کی دوستی باعثِ مسرّت ہوئی۔ اس کے بعد وہ اقبال سے برابر ملتے رہے۔ دونوں کے درمیان ان ملاقاتوں میں شعروشاعری کے مسائل، فلسفہ اور دیگر متعدد مسائل پر گفتگو ہوتی۔ ان ملاقاتوں میں مولانا ان کے تبحر علمی اور غیر معمولی شعری استعداد سے بے حد متاثر ہوتے رہے۔ مولانا کے اخبار ''زمیندار'' میں ترکِ موالات کی تحریک کے زمانہ میں جب اقبالؔ مہر بہ لب تھے تو اُن کے دوست حکیم محمد حسین عرشیؔ نے اُن کا سکوت توڑنے کے لئے ''خطاب بہ اقبال'' کے زیرِ عنوان چند اشعار کہے اور مولانا نے انہیں اخبار ''زمیندار'' میں شائع کیا۔ مولانا ظفر علی خان ''زمیندار'' کا یہ پرچہ لیکر اقبالؔ کے پاس گئے۔ جب اقبالؔ نے یہ اشعار دیکھے تو اُنہوں نے فرمایا کہ میں پہلے ہی اپنا پیغام مثنوی ''اسرارِ خودی'' اور ''رموزِ بے خودی'' میں دے چکا ہوں۔ تاہم چند مزید اشعار ''زمیندار'' میں اشاعت کی غرض سے دیئے۔ اقبالؔ کا کلام دوسرے کئی رسائل اور اخبارات کے علاوہ ''زمیندار'' میں بھی شائع ہوتا تھا۔ ان کی بعض نظموں پر مولانا نے تعریفی شذرے بھی تحریر کئے ہیں۔ مولانا نے اقبالؔ کے معروف اور اہم خطبہ The Muslim Community-a Sociological Study کا اُردو میں ترجمہ ''ملّتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر'' کے عنوان سے کیا ہے۔ اقبالؔ اور مولانا دونوں نے ایک دوسرے کی نسبت اپنے خیالات کا اظہار نظم اور نثر میں کیا ہے۔ اقبالؔ مولانا سے بعض معاملات میں مشورہ بھی کیا کرتے تھے اور اُن کی رائے کو وقیع جانتے تھے۔ اقبالؔ کی خدمات کے اعتراف میں جب انگریزی سرکار نے اُنہیں 'سر' کا خطاب عطا کیا تو اُن کے بعض احباب جن میں مولانا بھی شامل تھے، نے شکایت کی اور اقبالؔ پر لطیف چوٹیں کیں لیکن اقبال نے انہیں قطعی برا نہ مانا

بلکہ ان کے جواب میں اقبالؔ مولانا کے کلام کی تعریف کرتے رہے۔ مولانا نے اقبالؔ کی وفات پر ''آہِ اقبال'' کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے۔ اُس کی ابتداء اس شعر سے ہوتی ہے۔

گھر گھر یہی چرچے ہیں کہ اقبال کا مرنا　　اسلام کے سر پر ہے قیامت کا گذرنا

مدیر ''مخزن'' شیخ عبدالقادر اقبالؔ کے نہایت قریبی دوستوں میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ رسالہ ''مخزن'' ہی ہے جس کی بدولت اقبالؔ شروع شروع میں منظر عام پر آئے اور اُن کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ ''مخزن'' میں اقبال کا کلام سالہا سال شائع ہوتا رہا۔ شیخ عبدالقادر اُن کے کلام پر تعارفی شذرے تحریر کیا کرتے تھے جن میں بالعموم موصوف کے تنقیدی نظریات کی وضاحت اگرچہ نہیں ہوتی تاہم یہ شذرے اقبال کے کلام سے متعلق بہت سے اہم نکات کو سمجھنے میں ہماری معاونت کرتے ہیں۔ ان شذروں کی تاریخی اہمیت ہے۔ رسالہ ''مخزن'' کے شماروں میں وقتاً فوقتاً اقبال کی تخلیقات شائع ہوتی رہیں اس طرح مذکورہ رسالہ میں اقبالؔ کے کلام کی ابتدائی شکل وصورت کو دیکھا جاسکتا ہے۔ اقبالؔ اور شیخ عبدالقادر دونوں نے کچھ عرصہ یورپ میں ساتھ گذارا۔ جب اقبالؔ نے ۱۹۲۴ء میں ''بانگِ درا'' ترتیب دی تو اُنہوں نے اس پر شیخ عبدالقادر سے دیباچہ لکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ حالانکہ اُس زمانے میں اربابِ علم وادب کی کوئی کمی نہ تھی تاہم ''بانگِ درا'' کا دیباچہ تحریر کرنے کا شرف اقبالؔ نے شیخ عبدالقادر ہی کو بخشا۔ شیخ عبدالقادر نے اقبال پر اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں مضامین لکھے ہیں۔ ''نذرِ اقبال'' جسے محمد حنیف شاہد نے مرتب کیا ہے، میں اقبال پر شیخ عبدالقادر کی تحریریں درج ہیں۔ اقبالؔ نے ''بانگِ درا'' میں اپنے اس دیرینہ رفیق اور ہم خیال ہم عصر پر ایک نظم ''عبدالقادر کے نام'' لکھی ہے جس میں اقبال نے اُنہیں اپنے دلی ارادوں سے آگاہ کرتے ہوئے انہیں عملی جامہ پہنانے پر آمادہ کیا ہے ؎

اُٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا اُفقِ خاور پر　　بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کردیں

اور ؎

شمع کی طرح جئیں بزم گہہ عالم میں　　خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کردیں

نادرؔ کا کوروی کے ساتھ میر غلام بھیک نیرنگؔ کو اقبال نے اپنا ہم صفیر یا ہمنوا کہا ہے، اور اس طرح تثلیث فی التوحید میں شامل کیا ہے۔ ابتداً جب میر نیرنگ نے اقبال کی یہ غزل دیکھی ؎

برسرِ زینت جو شمعِ محفلِ جانانہ ہے　　شانہ اس کی زلفِ پیچاں کا پر پروانہ ہے

تو وہ اُن کی شعری صلاحیتوں کے قائل ہو گئے اقبالؔ نے بھی میر نیرنگ کا کلام دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو موصوف نے اقبالؔ کی خدمت میں ایک غزل بھیج کر اُن کی خواہش پوری کر دی۔ غزل کا ایک شعر یہ تھا ؎

حرم کو جانا جنابِ زاہد یہ ساری ظاہر پرستیاں ہیں　　میں اُس کی رندی کو مانتا ہوں جو کام لے دیر سے حرم کا

لاہور کے مشاعروں میں، جو بھاٹی دروازہ بازارِ حکیماں میں حکیم امین الدّین بیرسٹر اور حکیم شہباز الدّین کے مکان پر منعقد ہوتے تھے، میر نیرنگ اقبالؔ کے ساتھ شریک ہو کر دادِ سخن دیتے تھے۔ دونوں کی ایک دوسرے سے ملاقاتیں بھی ہو چکی ہیں۔ اقبالؔ بی۔ اے اور میر نیرنگ ایف۔ اے کے طالب علم تھے۔ دونوں بورڈنگ ہاؤس میں رہتے تھے، دونوں کو شعر و شاعری سے گہرا شغف تھا چنانچہ کالج کے درس اوقات کے علاوہ دونوں کا زیادہ تر وقت ساتھ گذرتا تھا۔ ادبی مباحث کے علاوہ شعر و شاعری بھی ہوتی رہتی تھی۔ اقبالؔ نے اُردو شاعری کی اصلاح و ترقی کے لئے جو کوششیں (اجتہادی) کیں اُن کا ذکر وہ کالج کی طالب علمی کے ایّام میں میر نیرنگ سے کیا کرتے تھے۔ اقبال جب ۱۹۰۸ء میں یورپ سے لوٹے تو میر نیرنگ نے اُن کی واپسی کے موقعے پر ایک محفل میں، جو اُن کی آمد کی خوشی میں منعقد کی گئی تھی، اور جس میں کئی مشاہیر نے شرکت کی تھی، چند اشعار سنائے اور بعد میں شیخ عبدالقادر کے ماہنامہ ''مخزن'' ۱۹۰۸ء کے اگست کے شمارے میں ''ترانۂ مسرّت یعنی آمد اقبال'' کے عنوان سے شائع ہوئے۔

۱۔ اس نظم کی زمین اقبالؔ کی پسندیدہ زمینوں میں سے ہے۔ اس سے پہلے اقبال اسی آہنگ، اسی بحر اور اسی قافیے میں اپنی دو نظمیں ''جگنو'' اور ''سلیمیٰ'' کے عنوان سے کہہ چکے تھے۔

؎ فصلِ بہار آئی ہے گلشنِ سخن میں — اک جشن ہو رہا ہے مرغانِ نغمہ زن میں
وہ مژدۂ مسرّت لائی صبا چمن میں — پھولے نہیں سماتے پھول اپنے پیرہن میں
یورپ کی سیر کر کے اقبال واپس آئے — خوشیاں منائیں مل کر اہلِ وطن وطن میں
ہے آمدِ مسرّت اقبال تیری آمد — خوشیاں ہیں اہلِ دل میں عیدیں ہیں اہلِ فن میں
سر آنکھوں پر بٹھایا یورپ میں تجھ کو سب نے — غربت میں بھی رہا تو گویا سدا وطن میں
پھر تیرے دم سے ہونگے تازہ سخن کے چرچے — پھر رونقیں رہیں گی یاروں کی انجمن میں

اقبال نے فارسی مثنوی ''اسرارِ خودی'' کی اشاعت کے بعد اس کا ایک نسخہ کئی ارباب علم وادب جن میں اُن کے مخلص دوست میر نیرنگ بھی شامل تھے، کو بھی بھیجا۔ موصوف نے مثنوی سے متعلق اختلافات کا ایک طومار باندھ کر اقبال کو ارسال کیا اور یہ بھی تحریر کیا کہ وہ یہ تمام اختلافات ایک مضمون کی شکل میں شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ لیکن اقبال نے اُنہیں یہ کہہ کر روک لیا کہ ان پر تبادلۂ خیالات ہوگا اور پھر ضروری سمجھنے پر آپ مضمون بھی شائع کر سکتے ہیں۔ اُنہوں نے میر نیرنگ کو لکھا کہ اس مرتبہ اُنہوں نے قرآن پاک کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ خیالات ظاہر کیے ہیں۔ تو میر نیرنگ نے مضمون کی اشاعت کا ارادہ ترک کیا۔ البتہ گاہے گاہے اقبال کے نام تحریر کیے گئے خطوط میں اور زبانی اُن سے اس بارے میں مذاکرہ ہوتا رہا۔ میر نیرنگ کے نام اقبال نے کئی خطوط لکھے ہیں جو اقبال نامہ حصۂ اوّل مرتبہ شیخ عطاء اللہ، روحِ مکاتیب اقبال مرتبہ محمد عبداللہ قریشی اور غالباً انوارِ اقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

منشی محمد الدّین فوق کی خدماتِ کشمیر سے خوش ہو کر اقبال انہیں ''مجدّد الکشامرہ'' کہتے تھے۔ فوق صاحب ایک مورّخ ہونے کے ساتھ ساتھ، شاعر ادیب اور صحافی بھی تھے۔ موصوف اپنے اخبارات اور رسائل، میں اقبال کی حیات، شخصیت اور کارناموں پر وقتاً فوقتاً اظہارِ خیال کرتے۔ ''کشمیری میگزین'' کے ۱۹۰۹ء کے اپریل کے شمارے میں اقبال کے سوانحی حالات ''حالاتِ اقبال'' کے زیرِ عنوان لکھ کر شائع کیے جس کے پیشِ نظر کئی ماہرین اقبالیات نے اُنہیں اقبال کا پہلا سوانح نگار قرار دیا ہے تاہم ڈاکٹر اکبر حیدری کو ''کلامِ

اقبالؔ'' (نادر و نایاب رسالوں کے آئینے میں) میں اس کی صحت پر اعتراض ہے، اُن کے نزدیک اقبال پر سب سے پہلا سوانحی مضمون شیخ عبدالقادر نے لکھا ہے جو لکھنؤ سے شائع ہونے والے رسالہ ''خدنگِ نظر'' کے ۱۹۰۲ء کے مئی کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اُن کا کہنا ہے کہ یہ مضمون دس صفحات پر مشتمل ہے اور اس کے ساتھ اقبال کی ایک تصویر بھی شائع ہوئی تھی۔ بہرحال فوقؔ صاحب نے اقبالؔ پر سوانحی مضمون ''حالاتِ اقبال'' میں اُن کا سنِ پیدائش ۱۸۷۵ء قرار دیا تھا جو بعد کی تحقیق کی رُو سے ۱۸۷۷ء قرار پایا۔ فوقؔ صاحب نے مذکورہ مضمون میں اقبالؔ کا تعلق پیروگوت سے بتایا ہے لیکن ڈاکٹر اکبر حیدری نے اِسے جھٹلایا ہے۔ تاہم سوانحِ اقبال پر تحریر کیے گئے فوقؔ صاحب کے مضمون کی تاریخی اہمیت سے ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس مضمون کو خود اقبال نے بھی بہت پسند فرمایا تھا اور اس کی اشاعت کے کئی برس گذر جانے کے بعد اس کی ایک کاپی فوقؔ صاحب سے طلب کی تھی۔ اقبالؔ فوقؔ صاحب کی خدمات کو پسند فرماتے تھے۔ چنانچہ اُن کی کئی کتابوں پر تقریظ لکھی ہے، جیسے علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کا مقدمہ اقبالؔ ہی کا تحریر کیا ہوا ہے۔ اقبالؔ اور فوقؔ صاحب ایک دوسرے کے بہی خواہ تھے۔ دونوں کو ایک دوسرے سے بے پناہ عقیدت تھی، جس کا ثبوت فوقؔ صاحب کے نام اقبال کے تحریر کیے گئے خطوط سے فراہم ہوتا ہے۔ اپنی ایک غزل میں اقبالؔ کی مفارقت کا ذکر حسرت بھرے انداز میں کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

اجل اُس مردِ حق کو بھی لے گئی یارب — حقیقت کا جسے بھیجا بنا کر ترجمان تو نے
ہوئے جس کے سے اسرارِ خودی و بے خودی ظاہر — نہ پلوائی کبھی وہ مے مجھے پیرِ مغاں تو نے

''حشر کی آمد'' کے عنوان سے لاہور میں مشہور ڈراما نویس آغا حشر کاشمیری کی پہلی مرتبہ آمد پر اقبال نے یہ شعر فی البدیہہ کہا تھا ؎

شور ایسا ہے کہ قصابوں کی ہو جیسے برات — آیئے لاہور کی یہ بزم ماتم دیکھیے

فانیؔ بدایونی اقبالؔ کو شاعر نہیں ناصح کہتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقبالؔ بھی فانیؔ بدایونی کے رنگ کو پسند نہیں کرتے تھے۔ جیسا کہ ذیل کے اشعار سے ظاہر ہے ؎

شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے رونق　　افکار میں سرمست، نہ خوابیدہ نہ بیدار
موت کی نقش گری ان کے صنم خانوں میں　　زندگی سے ہنر ان برہمنوں کا بیزار

مشہور و معروف افسانہ نگار سیّد سجاد حیدر یلدرم اقبال کے قدردانوں میں سے تھے۔ اقبال نے ان کا افسانوی مجموعہ ''خیالستان'' پنجاب یونیورسٹی کے بی۔اے کے نصاب میں شامل کروایا تھا۔ اُنہوں نے یلدرم کے نام جو خطوط لکھے ہیں، وہ اُن کی ذات سے اقبال کے خاصے لگاؤ کے آئینہ دار ہیں۔ اقبال نے یلدرم کو علی گڈھ میگزین کے ۱۹۲۵ء کے جوبلی نمبر میں اپنی ایک فارسی نظم بعنوان ''تنہائی''[1] بغرض اشاعت بھیجی تھی جس کے ایک سائڈ پر موصوف کے نام اقبال کا ایک خط مرقوم ہے۔ خط کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال ادب کے معاملات کی نسبت یلدرم کو بھی لکھتے تھے۔ اقبال کی شاعری کے ابتدائی زمانہ میں زبان کے ماہرین اُن کے کلام میں زبان کی خامیوں پر نکتہ چینی کرتے اور اُن کے یہاں محاورات کی غلطیوں کو خوب اچھالتے۔ تاہم یہ سجاد حیدر یلدرم ہی ہیں جنہوں نے اُس زمانہ میں اقبال کی شعری عظمت کا احساس دلایا اور ان کی شاعری کے تئیں تنگ دلی، اور کوتاہ نظری کے رویئے کو ترک کرنے اور وسیع القلبی اور کشادہ دلی کے ساتھ نہایت سرعت کے ساتھ ارتقائی منازل طے کرنے والے اس عندلیب گلشن کی خداداد صلاحیتوں کا اعتراف کرنے کی طرف توجہ مبذول کروائی۔ چنانچہ اس اُبھرتے ہوئے نئے ہم صفیر۔ اقبال کا خیر مقدم ''ایک نیا ستارہ۔ اقبال'' کے زیرِ عنوان مضمون سے کیا گیا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کو اقبال کے کلام سے گہرا شغف تھا، چنانچہ موصوف نے کلامِ اقبال کے بعض عمدہ نمونے اپنے قوّال کو یاد کروادئے تھے اور حسبِ خواہش اُن کی مترنم آواز میں کلامِ اقبال سے محظوظ اور مسرور ہوتے۔ مولانا ماجد نے اپنے پرچوں سچ، صدق، اور صدقِ جدید میں اقبال کے کارناموں پر تبصرے کئے ہیں۔ ان تبصروں میں اختصار اور جامعیت پائی جاتی ہے۔ مولانا ماجد اور اقبال کی آپس میں مراسلت بھی رہی ہے،

۱۔ نیابی در جہاں یارے کہ داند دل نوازی را　　بخود دگم شو نگہ دارد آبروئے عشق بازی را

جہاں اقبالؔ دیگر اربابِ علم و فضل سے استصواب اور استفسار کیا کرتے وہاں گاہے گاہے مولانا ماجدؔ بھی اسلامی اصطلاحات کے سلسلہ میں اقبال سے اُن کی رائے دریافت کر لیتے۔

برج نرائن چکبستؔ نے ۱۹۱۸ء میں لکھنؤ سے 'صبحِ اُمید' کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا تھا جسے اکبرالہ آبادی، عبدالماجد دریابادی، حسرت موہانی، سجّاد حیدر یلدرم، سر تیج بہادر سپرو، نواب ذوالفقار جنگ اور سری رام دہلوی کے علاوہ علاّمہ اقبالؔ کی قلمی معاونت حاصل تھی۔ اس رسالہ کی پہلی ہی جلد اور پہلے ہی شمارہ میں جو اکتوبر ۱۹۱۸ء کو شائع ہوا، اقبالؔ کی فارسی نظم ''تنہائی'' شائع ہوئی تھی۔ اسی نمبر اور اسی شمارہ میں اقبالؔ کی فارسی مثنوی ''رموزِ بے خودی'' پر چکبست کا تبصرہ شائع ہوا تھا۔ رسالہ کے مختلف شماروں میں اقبال کا کلام اور اُن کے کارناموں پر مضامین شائع ہوتے رہتے تھے۔ شیخ عبدالقادر کے ماہنامہ ''مخزن'' کے ۱۹۰۳ء کے نومبر کے شمارہ میں ''دربار بہاول پور'' کے عنوان سے والیٔ بہاولپور کے جشن تاجپوشی کی تہنیت میں اڑتالیس (۴۸) اشعار پر مشتمل اقبال کا جو قصیدہ

بزمِ انجم میں ہے گو چھوٹا سا اک اختر زمیں آج رفعت میں ثریا سے بھی ہے اوپر زمیں

شائع ہوا تھا، اُس پر چکبستؔ نے ''کلامِ اقبال'' کے عنوان سے ایک مضمون حسرت موہانی کے رسالہ ''اردوئے معلیٰ'' علی گڈھ کے ۱۹۰۴ء کے اپریل کے شمارے میں لکھا۔ مضمون میں اقبال کے مذکورہ قصیدہ کے مختلف اشعار کی زبان، تراکیب الفاظ و معانی اور تلمیحات پر چکبستؔ نے کئی اعتراضات عائد کرنے کے باوجود اس میں موجود خوبیوں پر روشنی ڈالی ہے۔

لسان الہند عزیزؔ لکھنوی کی غزلوں میں موجود شعری صلاحیتوں کے اقبالؔ دل سے قائل تھے۔ جب اُن کا مجموعۂ غزلیات ''گلکدہ'' کے نام سے ۱۹۱۸ء میں پہلی مرتبہ نول کشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوا، تو کئی اساتذہ، علماء اور ادباء نے اس پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اقبالؔ نے بھی عزیزؔ لکھنوی کی فنکارانہ عظمت کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کلامِ عزیزؔ کو سدا استفادے کی نظر سے دیکھنے کا اعتراف کیا۔ علاّمہ نے ''گل کدہ'' کو پنجاب یونیورسٹی کے آنرز اُردو نصاب میں داخل کرانے کی تجویز پیش کی تھی۔ عزیزؔ کے ایک

اور مجموعۂ غزلیات ''انجم کدہ'' میں ایسے بہت سے اشعار ملتے ہیں جن میں اقبالؔ کے رنگ کی جھلکیاں صاف طور پر دیکھی جا سکتی ہیں۔ فلسفۂ حرکت، عظمتِ انسان، اور ذوقِ عمل پر اقبالؔ نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، عزیزؔ نے بھی اپنے غزلیہ اشعار میں ان موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے۔ اقبالؔ اور عزیزؔ دونوں ہم عصر شعراء اُردو کے مقابلے میں فارسی کی وسیع دامانی اور شوکتِ الفاظ سے زیادہ معنی آفرینی کے قائل تھے۔ سر تیج بہادر سپرو کے بقول اقبالؔ نے اپنی پرائیویٹ چھٹیوں میں کلامِ اصغرؔ کو سراہا ہے۔ وہ اُن کے کلام میں جدّت و تاثیر کے قائل تھے اور اُنہوں نے اسے اردو ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ قرار دیا ہے۔ تاہم اقبال کی وہ پرائیویٹ چھٹیاں دستیاب نہیں ہوتیں جن میں اُنہوں نے کلام اصغر کی سراہنا کی ہے۔ اصغر گونڈی اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اُن کے شعری مجموعے ''سرودِ زندگی'' میں یہ فارسی غزل بھی موجود ہے۔

درحریمش امتیاز ایں و آں بے سود بود   جانِ مشتاقاں بہ سیر بود و ھم نابود بود

اقبالؔ کو اصغر کی یہ غزل بہت پسند تھی چنانچہ اقبالؔ نے اسے سن کر مزید دو شعر کہہ کر اصغر کو انہیں اپنی اس غزل کے ساتھ رکھنے کی ہدایت کی تھی۔ یہ دو شعر اس طرح تھے۔

چشمِ آدم آنسوئے افلاک نورش ھم نہ یافت   از خیالِ مہر و مہ اندیشہ گرد آلود بود

من درونِ سینۂ خود سومناتے ساختم   آستانِ کعبہ را دیدم جبیں فرسود بود

اقبالؔ نے اصغر کی غزل پر ان دو اشعار کا اضافہ کر کے اسے مزید رفعت اور وقعت عطا کی۔ اصغر نے مندرجہ بالا غزل کے ساتھ یہ شذرہ تحریر کیا تھا:

> ''یہ غزل قیامِ لاہور کے زمانے میں لکھی گئی تھی۔ علامہ سر اقبالؔ نے اسے سن کر بہت پسند فرمایا اور خود بھی دو شعر اُسی وقت موزون کر دئے اور ہدایت فرمائی کہ انہیں بھی اپنی غزل کے ساتھ رکھنا۔''

اصغرؔ اقبالؔ کی نسبت کیا رائے رکھتے تھے۔ اس کا بہت حد تک اندازہ اُن کے ایک مکتوب جو انہوں نے رسالہ ''نیرنگ خیال'' کے مدیر کے نام لکھا ہے اور جس میں اُنہوں نے اقبالؔ

کے تئیں اپنی بے پناہ عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ اُنہوں نے اپنے آپ کو اقبالؔ کا مدّاح اور نیاز مند قرار دیا ہے۔ اقبالؔ اور اصغرؔ دونوں کے نظریۂ فن میں کافی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ دونوں کے نزدیک فن کا باقاعدہ طور پر ایک مقصد ہے اور وہ ہے انسانی جذبات کو اعلیٰ اقدار سے ہمکنار کرنا۔ شاعری سے اقبالؔ کا مقصد خیالات میں انقلاب پیدا کرنا ہے اور اس مقصد کے پیشِ نظر وہ جن خیالات کو مفید تصوّر کرتے ہیں، اُنہیں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اصغرؔ نے جذبات کی پاکیزگی، لطافت اور ترفع پر زور دیا ہے۔

علومِ اسلامی کی جوئے شیر کے فرہاد سیّد سلیمان ندوی اعظم گڈھ سے جو رسالہ ''معارف'' کے نام سے نکالتے تھے اُس کے مختلف شماروں میں اقبال کے کلام کے علاوہ اُن کے کارناموں پر سیّد صاحب کے قلم سے وقتاً فوقتاً شذرے بھی شائع ہوتے تھے۔ اقبالؔ، سیّد سلیمان ندوی اور سر راس مسعود تینوں مشاہیر نے غالباً ۱۹۳۳ء میں ایک ساتھ افغانستان کا دورہ کیا، اور اس دورے کی تفصیلات رسالہ ''معارف'' میں شائع ہو چکی ہیں۔ سیّد صاحب کے نام اقبال کے ستر خطوط ''اقبال نامہ'' حصۂ اوّل مرتبہ شیخ عطاء اللہ میں شامل ہیں جن کے مطالعے سے دونوں معاصرین کے آپسی روابط کا حال معلوم ہوتا ہے۔ اقبال سیّد صاحب سے مختلف موضوعات پر استفسار کیا کرتے تھے۔

سیماب اکبر آبادی نے اقبال کے کلام میں زبان کی خامیوں کی نشاندہی کی ہے۔ تاہم ان کے انتقال پر قطعۂ تاریخ بھی لکھا ہے۔ مشہور و معروف ماہرِ اقبالیات ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی اقبالؔ سے کئی ملاقاتیں ہوئی ہیں اس طرح انہیں اقبالؔ کی شخصیت کو قریب سے دیکھنے کے کئی مواقع میسّر ہوئے ہیں۔ اقبالؔ نے خلیفہ صاحب کے روشن اور تابناک مستقبل کا پہلے سے ہی اندازہ کیا تھا چنانچہ موصوف جب ایم۔اے فلسفہ کے طالب علم تھے تو انہیں ایام میں اقبالؔ نے اُنہیں اپنی گرانقدر تصنیف ''اسرارِ خودی'' عنایت کی تھی۔ خلیفہ صاحب نے بعد میں ''فکرِ اقبال'' کے نام سے ایک معرکتہ الآرا کتاب لکھنے کے علاوہ اقبالیات پر بہت سے مضامین پر مشتمل کتاب مقالات حکیم (غالباً دوسرا حصّہ۔ مقالات

حکیم تین حصّوں پر مشتمل ہے) کے نام سے لکھی۔ عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہونے پر اقبالؔ کو وزیراعظم سر اکبر حیدری نے جب اس یونیورسٹی کے شعبۂ فلسفہ کے لئے پروفیسر کی ضرورت کے سلسلہ میں خط لکھا تو اقبالؔ نے خلیفہ صاحب کے حق میں سفارش کی۔ خلیفہ صاحب نے جب انگریزی اخبار "Observer" کی ادارت سنبھالی تو اس میں ایک مضمون لکھا جس میں بتایا گیا کہ حکومت خوشامد کرنے والوں کو بڑے بڑے عہدوں پر تعینات کرتی ہے اور باصلاحیت اور غیر معمولی طور پر قابل اشخاص کو نظر انداز کر دیتی ہے۔ یہ اشارہ اقبال کی طرف تھا۔ اقبالؔ نے خلیفہ صاحب کو کئی مشاعروں میں کلام سناتے ہوئے دیکھا ہے۔ لاہور کے برکت علی محمڈن ہال میں منعقد کئے گئے ایک مشاعرے میں خلیفہ صاحب نے ایک نظم "دیدۂ تر" کے عنوان سے پڑھی تھی جسے سامعین نے بہت سراہا تھا۔ اقبالؔ نے اس نظم کو قوم کے حق میں حیات بخش قرار دیا تھا۔ خلیفہ صاحب نے اقبالؔ کے انتقال پُر ملال پر ایک نظم بھی کہی ہے جس میں علاّمہ کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے ؎

سینہ تھا ترا مشرق و مغرب کا خزینہ　　دل تھا ترا اسرار و معارف کا دفینہ
اس ساز کے پردے میں تھی عرفان کی آواز　　کیا عرش سے ٹکرائی ہے انسان کی آواز

مولانا تاجورؔ نجیب آبادی نے اگرچہ کلامِ اقبالؔ میں زبان کی خامیوں کی نشاندہی کی ہے تاہم ان کے محاسن کلام کا بھی نہایت کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ وہ جب اقبالؔ کا کلام سنتے تو آب دیدہ ہو جایا کرتے تھے۔

ابوالاثر حفیظؔ جالندھری کے یہاں اگرچہ ہندی گیت کی فضا عام طور سے ملتی ہے تاہم وہ اقبالؔ کے اثرات سے یکسر بے نیاز بھی نہیں رہے ہیں۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے بالکل بجا فرمایا ہے کہ اُن کا فن اقبال کے اثر کے تحت حجازی ہو گیا اور فیضانِ اقبال کے نتیجے میں اُن کے دل میں اسلام سے محبت اور عشقِ رسولؐ کے جذبے کی کارفرمائی ملتی ہے۔ حفیظؔ نے خود بھی اپنی ایک نظم میں اقبالؔ کو اپنا رہنما قرار دیا ہے ؎

میرے دل میں بیٹھ مجھ کو سوئے منزل لے کے چل　　ناخدا ہے تو یہ کشتی تا بہ ساحل لے کے چل

تیرا درسِ زندگی میرا شریکِ حال ہے اے میرے روشن ستارے تو میرا اقبال ہے

شاعرِ جمال اور ہندوستانی تہذیب کے ترجمان فراقؔ گورکھپوری کو اقبالؔ کی شاعری میں جنگجوئی کا جذبہ کارفرما نظر آیا ہے، دراصل فراقؔ اپنے آپ کو اقبالؔ کی فکر اور اُن کی فکر کے بنیادی سرچشموں سے ہم آہنگ نہیں کر پائے ہیں۔ دونوں کے یہاں فکر کی دو جداجدا راہیں ہیں۔ اور پھر فراقؔ کا تعلق تنقید کے تاثراتی دبستان سے ہے چنانچہ کلامِ اقبال کا مطالعہ کرنے کے دوران اُن کے ذہن پر جو تاثرات قائم ہوتے ہیں اُنہیں وہ صفحۂ قرطاس پر اُتار دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فراقؔ کی تنقیدوں میں غور و فکر اور فن کار کے ساتھ ذہنی و فکری سفر کرنے کا فقدان نظر آتا ہے۔ تاہم اس بات سے بھی انکار کی گنجائش نہیں کہ اُنہوں نے اقبالؔ کے بعض اشعار کی سراہنا بھی کی ہے۔ اقبالؔ کے مندرجہ بالا معاصر شعراء اور ادباء کے علاوہ اُن کے اور بھی بہت سے معاصر شعراء اور مصنفین ہیں جن میں مولانا ابوالکلام آزاد، جمیلؔ مظہری، مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ، مولانا وحیدالدین سلیمؔ، منشی پریم چند، خواجہ حسن نظامی، حکیم محمد حسین عرشیؔ، اور کئی دیگر معاصرین کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ ان میں سے بعض معاصرین نے اقبالؔ کے گہرے اثرات قبول کئے ہیں، اور انہیں اپنی منظوم اور منثور تحریروں میں زبردست خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ بعض نے ان کے افکار و خیالات پر تبصرے بھی کئے ہیں، بعض سے اقبالؔ کی خط و کتابت بھی رہی ہے، جس کے پیشِ نظر اقبال اور اُن کے معاصر شعراء اور ادباء کے یہاں ایک دوسرے کی نسبت تاثرات کا پتہ چلتا ہے۔ بعض کی تحریروں سے اقبال نے بھی اخذ و قبول کیا ہے۔

اقبال انسٹی ٹیوٹ کی چند مطبوعات کا جائزہ

اُردو شاعری کے اُفق پر ایک شاعر کی حیثیت سے طلوع ہونے کے باعث اقبال پر لکھنے کا آغاز ان کی حیات ہی میں ہوا اور بعد میں اس سلسلے میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا۔ ہزاروں کی تعداد میں کتابوں، مقالات کے مجموعوں اور متفرق مضامین پر مشتمل ایک وافر اور بسیط ذخیرہ جمع ہوتا گیا۔ ہندو پاک سے شائع ہونے والے رسائل کے اقبال نمبر نکالے گئے۔ ''نیرنگ خیال'' کا اقبال نمبر اُن کی حیات ہی میں ۱۹۳۲ء میں لاہور سے شائع کیا گیا، علامہ کی وفات سے لیکر کے آج تک جن معتبر اور مستند رسائل کے اقبال نمبر شائع ہوئے، اُن میں اُردو سہ ماہی اورنگ آباد دکن (۱۹۳۸ء) سب رس، ادارۂ ادبیاتِ اُردو حیدرآباد دکن (جون ۱۹۳۸ء) اور علی گڈھ اُردو میگزین (اکتوبر ۱۹۳۸ء) بھی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر معیاری رسائل کے بھی اقبال نمبر شائع کیے گئے۔ مثال کے طور پر شاعر (بمبئی) صحیفہ (لاہور) ماہِ نو (کراچی) آجکل (دہلی) شیرازہ (سرینگر) وغیرہ وغیرہ۔ ۱۹۷۷ء میں اقبال کی صد سالہ تقریبات منائی گئیں اور اس سال اقبالیاتی ادب پر مشتمل کتابوں کا ایک سیلاب اُمڈ آیا۔ اس کے بعد سے آج تک اقبال پر لکھنے کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ اقبالیات پر مشتمل سرمائے کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال پر عمدہ کتابوں کے پہلو بہ پہلو ایسی کتابیں اور مقالات بھی لکھے جا چکے ہیں جن میں افراط و تفریط کا بہت زیادہ عمل دخل رہا ہے۔ اقبالیاتی ادب کا ایک حصّہ وہ بھی ہے جس کی نوعیت زیادہ تر ستائشی، جذباتی اور انتہا پسندانہ ہے۔ تاہم اُس ادب کی بھی کمی نہیں جس کے تناظر میں اقبال کو صحیح طور سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور اُن کا بڑی سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ اقبال کی تفہیم،

اُن کے صحیح مقام کے تعین اور مطالعۂ اقبال کو صحیح سمت عطا کرنے کی غرض سے اقبالیاتی ادب کا تنقیدی جائزہ لینا اور اس کی تعینِ قدر ناگزیر بن گیا۔ خود علامہ اقبال نے ہر زماں اپنے عمل کا احتساب کرنے کی تلقین کی ہے۔ اقبالیاتی ادب کا مقصد اس کی سمت و رفتار کا تعین کرنا ہے، اس کی پیش رفت کا جائزہ لینا ہے تا کہ مستقبل میں اقبالیاتی ادب کی کارکردگی کو بہتر اور وقیع بنایا جا سکے۔ اقبالیاتی ادب کے احتساب اور مطالعۂ اقبال کے لئے سہولت بہم پہنچانے کی غرض سے سب سے پہلی کوشش عالم بے بدل اور اقبال کے شیدائی قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کی تالیف ''اقبالیات کا تنقیدی جائزہ'' ہے۔ یہ تالیف دراصل اس مقالے کی پھیلی ہوئی شکل ہے جو اقبال اکیڈمی پاکستان لاہور کی فرمائش پر قاضی صاحب نے تحریر کرنا شروع کیا تھا، مقالہ چونکہ وسعت اختیار کرتا گیا اس لئے قاضی صاحب موصوف کو اسے کتابی صورت میں ترتیب دینا پڑا۔ بہر حال یہ تالیف ۱۹۵۵ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آئی (اس کا نقش ثانی ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا) اس تالیف کا مقصد بقول قاضی صاحب اہلِ علم کی توجہ اقبال کے صحیح مطالعے کی جانب مبذول کرانا ہے۔ اقبالیاتی ادب کے نامور محقق ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اپنی کتاب ''اقبالیاتی جائزے'' میں قاضی صاحب کی مذکورہ تالیف کو قابل قدر اور عالمانہ قرار دیتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کی تصنیف ''اقبالیات کا تنقیدی جائزہ'' اپنے موضوع پر پہلا مبسوط جائزہ ہے۔ قاضی صاحب معروف معنوں میں اقبالی نہ تھے اور اُنہوں نے اقبالیات کو بطورِ خاص اپنا موضوع کبھی نہیں بنایا مگر وہ حقیقی معنوں میں ایک فاضل انسان تھے۔ اس لئے وہ اقبالیات پر ایک قابل قدر اور عالمانہ کتاب لکھنے میں کامیاب ہو گئے۔''[1]

۱۹۷۵ء میں اقبالیات کے معروف مخصص جناب رفیع الدین ہاشمی کی کتاب ''کتب اقبالیات'' کی اشاعت ہوئی جس میں اقبالیات کے موضوع کا سن ۷۵ء تک احاطہ کیا گیا

۱۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، اقبالیاتی جائزے، ص ۱۱

ہے۔ اقبال کی صد سالہ تقریبات کے موقعے پر اقبال اکیڈمی پاکستان نے اقبال سے متعلق معتدد کتابیں شائع کیں۔ ان میں جناب رفیع الدین ہاشمی کی ''کتابیاتِ اقبال'' کو اشاریہ ادب کا سنگِ میل قرار دیا گیا ہے۔ یہ کتاب نومبر ۷۷ء تک اقبال پر شائع ہوئی کتب، رسائل و جرائد کی خصوصی اشاعتوں اور غیر مطبوعہ تحقیقی مقالات کی فہرستوں کے حوالوں پر مشتمل ہے۔ ہاشمی صاحب نے اپنی کتاب ''اقبالیاتی جائزے'' میں اقبالیاتی ادب کا جائزہ لے کر متعدد تسامحات کی نشاندہی کر کے فکرِ اقبال کے صحیح منابع کی سمت رہنمائی کی ہے۔ اس کتاب میں اقبال پر معرضِ وجود میں آنے والے سوانحی سرمائے، عالمِ عرب اور بھارت میں ہونے والی اقبالیاتی کاوشوں اور بعض اہم کتابوں کو بھی تحقیق اور محاکمہ کا موضوع بنایا گیا ہے۔ اور صراحتِ فکر کے ساتھ استخراج نتائج کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی حیثیت تعارفی اور توضیحی ہونے کے ساتھ ساتھ تحقیقی اور تنقیدی بھی ہے۔ اُن کی یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۹۰ء میں منصۂ شہود پر آئی۔ اس طرح اقبالیاتی ادب کا تنقیدی جائزہ ماہرِ اقبالیات اور محققین اقبال وقتاً فوقتاً پیش کرتے رہے ہیں۔ اقبالیاتی ادب کا تنقیدی جائزہ لینے کے لئے کئی سمینار بھی منعقد کئے جا چکے ہیں۔ مثال کے طور پر ۱۹۹۶ء میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی کے اہتمام سے اقبالیات کا تنقیدی جائزہ'' کے موضوع پر ادارہ کے تیسرے ڈائریکٹر پروفیسر محمد امین اندرابی مرحوم نے شعبۂ اُردو جموں یونیورسٹی کے اشتراک سے کئی نشستوں پر مشتمل جو سمینار دو الگ الگ موقعوں پر ان دو یونیورسٹیوں میں منعقد کرایا تھا اُس میں چند نمایاں حیثیت کے اقبال شناسوں کے علاوہ کئی معتبر اربابِ علم و ادب نے شرکت کر کے اقبالیاتی ادب کے مختلف پہلوؤں کا تنقیدی جائزہ پیش کیا تھا۔ مذکورہ سمینار میں پڑھے گئے مقالات کو بعد میں ادارہ کے اہتمام سے کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔

گزشتہ دس برسوں میں اقبالیاتی ادب پر مشتمل ہندو پاک اور مغربی ممالک میں اقبال پر سینکڑوں کی تعداد میں کتابیں اور مقالات کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جہاں پہلے اقبال پر خاص نمبر نکالنے کا رجحان عام تھا۔ وہاں اب پچھلے دس برسوں میں بعض اہم

رسائل میں اقبال کے لئے گوشے مخصوص کئے گئے ہیں، جن کے تحت اقبال، اور اُن کے ماقبل، معاصر اور مابعد شخصیتوں سے اُن کا موازنہ کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات غالبؔ اور اقبالؔ جیسے عظیم شعراء پر مواد شائع ہوتا رہا ہے۔ رسالہ نقد ونظر (دہلی) میں پروفیسر اسلوب احمد انصاری ایک مستقل عنوان ''تجزیاتی مطالعے'' کے تحت اکثر وبیشتر اقبال کی غزلوں کے تجزیئے شائع کرتے رہے ہیں۔ یہ تجزیئے گاہے خود اسلوب صاحب کے نام سے اور گاہے اعلیٰ پایہ کی سخن فہم شخصیتوں کے نام سے شائع ہوتے رہتے ہیں۔

گزشتہ دس برسوں یعنی ۱۹۹۳ء سے لیکر کے ۲۰۰۲ء تک ہندوپاک میں اقبال پر جو کتابیں شائع ہوچکی ہیں، اُن میں سے بعض کے نام اس طرح ہیں:

جہانِ اقبال	سید معین الرحمٰن، ۱۹۹۷ء
اقبال اور دانتے	ڈاکٹر منظر حسین، اگست ۱۹۹۸ء
اقبال کی منتخب نظمیں اور غزلیں	پروفیسر اسلوب احمد انصاری، ۱۹۹۴ء
تفکیر دینی پر تجدید نظر (اقبال)	ترجمہ ڈاکٹر محمد سمیع الحق، ۱۹۹۴ء
اقبالیاتِ نذیر نیازی	عبداللہ شاہ ہاشمی، ۱۹۹۶ء
اقبال۔ شاعر اور سیاست دان	ڈاکٹر رفیق زکریا، ۱۹۹۵ء
اقبال اور قومی یک جہتی	ڈاکٹر منظر اعجاز، جون ۱۹۹۴ء
اقبال کا حرفِ تمنا	پروفیسر شمیم حنفی، ۱۹۹۶ء
اقبال۔ فن اور فلسفہ	نورالحسن نقوی، ۱۹۹۹ء
خطبات اقبال۔ ایک جائزہ	محمد شریف بقا، ۱۹۹۴ء
ذکرِ اقبال	عبدالمجید سالک، ۱۹۹۳ء

اور جناب بدیع الزماں کی چھ کتابیں۔

ایک بڑے فن کار کی شناخت کا اہم پہلو یہ ہے کہ وہ بغیر جغرافیائی حدود، رنگ ونسل، اور زبان کے بنی نوع انسان کی فلاح وبہبود کا خواہاں ہوتا ہے۔ وہ کسی مخصوص فرقے یا قوم

کی جاگیر نہیں ہوتا بلکہ اُس کی حیثیت بنی نوع انسان کے حق میں مشترکہ سرمائے کی ہوتی ہے۔ آفاقی اہمیت کے حامل اقبال کی اس حیثیت کے باوصف اہل کشمیر کی بیداری اور ترقی کی خاطر اُن کی کوششیں ناقابل فراموش ہیں چنانچہ اس نابغۂ روزگار شخصیت کی غیر معمولی اور بے لوث خدمات کے پیش نظر خطۂ کشمیر کی دانشگاہ میں آج سے پچیس چھبیس سال پہلے اقبال چیئر قائم کی گئی جو مرور ایام کے ساتھ ساتھ ایک مکمل اور مستقل ادارے میں تبدیل کی گئی۔ یہ ادارہ اپنی آفرینش سے اقبال کا نور بصیرت عام کرنے میں مصروف عمل ہے، چونکہ اقبالیات کا موضوع ایک ایسا بحرِ بے کنار ہے جس کی وسعتوں کی کوئی انتہا نہیں، چنانچہ گزشتہ دس برسوں پر مشتمل اقبالیاتی ادب کا احاطہ کرنے کے لئے ایک کتاب تو درکنار کئی کتابیں بھی کم پڑ سکتی ہیں۔ اس لئے میری معروضات اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی کے گزشتہ دس سالہ ادب جو سنہ ۹۳ء سے ۲۰۰۲ء تک شائع ہو کر منظر عام پر آیا، میں سے صرف ترتیب دئے گئے اقبالیاتی اشاریوں اور مضامین کے انتخاب کے جائزے تک ہی محدود رہیں گی۔

قبل اس کے کہ ان کا جائزہ لیا جائے، اقبال انسٹی ٹیوٹ کے متعلق مختصراً کچھ کہنا غالباً بے محل نہ ہوگا۔ ۱۹۷۷ء میں دانشگاہِ کشمیر میں اقبال چیئر کا قیام حکیم الامت علامہ محمد اقبال کے فکر و نظر کو عام کرنے کی غرض سے عمل میں لایا گیا۔ اُردو کے مشہور و معروف نقاد، شاعر اور اقبال شناس پروفیسر آل احمد سرور کو اس چیئر کے لئے اقبال پروفیسر اور بعد میں اس کے انسٹی ٹیوٹ میں تبدیل ہو جانے پر مذکورہ ادارہ کا ڈائریکٹر مقرر کیا گیا۔ یہ پہلا موقعہ تھا جب پوری دنیا میں اس نوعیت کی کوئی چیئر قائم کی گئی ہو۔ اقبالیاتی ادب کے نامور محقق ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے کشمیر میں اس چیئر کے قائم کئے جانے کو ایک اہم واقعہ سے تعبیر کیا ہے۔ ۱۹۷۹ء میں اقبال چیئر کو ایک مکمل اور مستقل انسٹی ٹیوٹ کا درجہ دیا گیا اور سال رواں یعنی ۲۰۰۲ء میں اسے Centre of Iqbaliyat and Comparative Studies یعنی مرکز اقبالیات اور تقابلی مطالعات جیسا وسیع اور اعلیٰ مقام عطا کیا گیا۔ ادارے کے پروگراموں میں دانشور اقبال کے فکر و نظر کو عام کرنے کی غرض سے سمیناروں، توسیعی خطبوں، مضمون

نویسی اور بیت بازی کے مقابلوں کے اہتمام، مونوگرافس کے تیار کرائے جانے اور اس نوع کے دیگر امور کے علاوہ ایم فل اور پی ایچ ڈی اسکالروں کی تربیت اور نگرانی جیسے عوامل شامل ہیں۔ ادارہ سے ایک تحقیقی اور تنقیدی مجلّہ ''اقبالیات'' کے نام سے شائع ہوتا ہے۔

کسی بھی موضوع پر تحقیق کرنے کے لئے حوالہ جاتی کتب کی فہرستوں کا دستیاب ہونا انتہائی ناگزیر ہے۔ ان کے ذریعے محقق کو اُس کے موضوع سے متعلق تمام کتابوں اور رسائل سے واقفیت بہم پہنچائی جاتی ہے۔ ان کے آئینے میں تحقیق کرنے والا اپنے مطالعے کی صحیح سمت کا تعین کر کے اپنے بیش قیمت کو ضایع ہونے سے بچاتا ہے۔ اشاریوں کی کئی قسمیں ہیں جیسے موضوعاتی اشاریے، توضیحی اشاریے، وغیرہ وغیرہ۔ اقبالیاتی ادب میں ابتداء ہی سے اشاریہ سازی کی ضرورت اور اہمیت کے احساس کے تحت وقتاً فوقتاً کئی اشاریے ترتیب دئے جا چکے ہیں۔ مثال کے طور پر اس سلسلے کی پہلی کتاب انگریزی میں Bibliography of Iqbal کے نام سے جناب عبدالغنی اور خواجہ نورِ الٰہی نے ۱۹۵۴ء میں مرتب کی تھی۔ اسی طرح ۱۹۷۷ء میں رفیع الدین ہاشمی کی ''کتابیاتِ اقبال'' اقبال اکیڈمی پاکستان کی جانب سے شائع کی گئی۔ اس طرح یہ سلسلہ آگے چل کر آج بھی برابر جاری ہے۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ بنیادی طور پر ایک تحقیقی ادارہ ہے جہاں ایم فل اور پی ایچ ڈی کے اسکالروں کی تربیت اور نگرانی کا کام انجام دیا جاتا ہے۔ اب تک اس ادارے سے ایم فل اور پی ایچ ڈی کرنے والے اسکالروں کی کل تعداد اکتیس تک پہنچ چکی ہے جن میں سے گزشتہ دہائی میں پندرہ اسکالر ایم فل اور تین پی ایچ ڈی کر چکے ہیں۔ اشاریہ سازی کی تحقیقی امور میں بڑی اہمیت ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے اشاریہ سازی کو تحقیق کی ایک اہم شاخ سے تعبیر کیا ہے۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ نے تحقیقی امور میں اشاریہ سازی کی ضرورت اور اہمیت کے پیش نظر ''مفتاحِ اقبال'' اور ''مطبوعاتِ اقبال انسٹی ٹیوٹ'' کے زیرِ عنوان دو اقبالیاتی اشاریے شائع کئے ہیں۔ انہیں ادارے کے لائبریرین جناب محمد عبداللہ خاور نے ترتیب دیا ہے۔ ''مفتاحِ اقبال'' ۱۹۹۴ء میں اور ''مطبوعات اقبال انسٹی ٹیوٹ'' مارچ

۱۹۹۹ء میں ترتیب پاکر شائع ہو چکے ہیں۔ اوّل الذکر موضوعاتی اعتبار سے اقبال پر ہندو پاک کے معتبر اور مستند رسائل میں اقبال شناسوں اور اربابِ علم و ادب کے وقتاً فوقتاً تحریر کئے گئے مقالات کی موضوعاتی فہرست ہے جب کہ موخر الذکر ادارہ کے زیر اہتمام ۱۹۷۸ء سے لیکر کے ۱۹۹۸ء تک شائع کی گئی مطبوعات میں درج مقالات کا توضیحی اشاریہ ہے۔ مفتاحِ اقبال میں اقبال سے متعلق مختلف موضوعات پر مشتمل تقریباً ساڑھے تین ہزار اُردو مقالات کی موضوعاتی فہرست بہم پہنچائی گئی ہے، اشاریہ میں اُن مقالات کی فہرست بھی شامل ہے جنہیں بعد میں مختلف مجموعوں یا کتابوں کی شکل میں شائع کیا گیا۔ مفتاحِ اقبال ۳۲ موضوعات کی فہرست پر مشتمل وہ اشاریہ ہے جس میں تقریباً ساڑھے چار ہزار حوالے دئے جا چکے ہیں۔ یہ وہ موضوعات ہیں جن پر کثرت کے ساتھ لکھا گیا ہے اور جو مقالات ان موضوعات کی فہرست کی ذیل میں نہیں آتے اُنہیں علیحدہ طور پر ایک عنوان ''متفرقات'' کے تحت آخر میں رکھ دیا گیا ہے۔ موضوعات اس طرح ہیں۔ اجتہاد، اسلوب، اماکن، انسانیت، تاثرات، تبصرے اور جائزے، تصورِ ابلیس، تصور خودی، تصور زماں و مکاں، تصوف، تعلیم، تنقید و تحقیق، خطبات، سماجیات، سوانح، سیاست، شعری محاسن، عشق رسولؐ، عہد، غزل، فکر و فن، فلسفہ، فن، قرآن، مذہب، مردِ مومن، مسجدِ قرطبہ، مشاہیر، مغرب، نظم، نوجوان اور متفرقات۔ یہ نہایت ہی اہم موضوعات ہیں جنہیں اشاریہ ساز نے حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیا ہے۔ ہر عنوان کے کئی ذیلی عنوانات ہیں، جیسے مقالہ، مقالہ نگار کا نام، کتاب، رسالہ اور ماہ و سال درج کیا گیا ہے۔ مفتاح اقبال کا پیش لفظ اقبال انسٹی ٹیوٹ کے سابقہ ڈائریکٹر پروفیسر محمد امین اندرابی مرحوم نے تحریر کیا ہے۔ اشاریہ کی ابتداء میں جناب عبداللہ خاور کا مقدمہ درج ہے جس میں اقبالیاتی اشاریوں کا ذکر کرتے ہوئے اقبال اکادمی لاہور کی طرف سے اقبالیاتی اشاریوں کو فروغ دینے کے کام کی سراہنا کرتے ہوئے انہیں وقیع قرار دیا گیا ہے لیکن بھارت میں اقبال سے متعلق اشاریہ سازی کو مایوس کن قرار دیتے ہوئے جناب عبدالقوی دسنوی کی کوششوں کی سراہنا کی گئی ہے۔

عبداللہ صاحب ایک اچھا لائبریرین ہونے کے ناطے فقط کتابوں کی محافظت ہی نہیں کرتے ہیں بلکہ اُنہوں نے محققین کی دشواریوں کو سمجھتے ہوئے ان کی رہنمائی کا فرض بخوبی انجام دیا ہے۔ موصوف اُردو ادب اور اقبالیات سے متعلق کئی اشاریئے ترتیب دئے جا چکے ہیں جن میں سے بعض مختلف رسائل جیسے جامعہ، اسلام اور عصرِ جدید، بازیافت اور اقبالیات وغیرہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ فاضل اشاریہ ساز نے اشاریہ سازی کے فن کے ساتھ اپنے مزاج کی مناسبت کا عمدہ نمونہ فراہم کیا ہے کیونکہ اس نوع کے امور میں جس صبر و استقلال، ذوق و شوق، باریک بینی اور دقت نظر کی ضرورت ہے، وہ موصوف کے اندر موجود ہے۔ اسی سبب کے تحت وہ ایک عمدہ اشاریہ ترتیب دینے میں کافی حد تک کامیاب ہو چکے ہیں۔ تاہم دو ایک باتوں کی طرف اشارہ کرنا غالباً نامناسب نہ ہوگا۔ پہلی بات یہ کہ اشاریہ میں دئے گئے ہر عنوان کے تحت مقالہ، مقالہ نگار، رسالہ، کتاب اور ماہ و سال ضرور درج کیا گیا ہے تاہم بعض مقامات پر جب محقق کسی مقالہ کو تلاش کرنے کی غرض سے درج کی گئی کتاب کو دیکھتا ہے تو مقالہ ندارد۔ اس کا سبب یہ ہے کہ کتاب کا نام تو صحیح دیا ہوا ہے لیکن بعض اوقات ترمیم، اضافے یا کسی تبدیلی وغیرہ کے تحت ایک ہی کتاب کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوتے ہیں، عبداللہ صاحب کتاب کا نام درج تو کر لیتے ہیں لیکن اُس کا ایڈیشن نہ دینے کے نتیجے میں محقق کو مقالے کی تلاش میں دشواری پیش آتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ ''مفتاحِ اقبال'' میں کسی مضمون کا حوالہ دیکھتے ہوئے نووارد ریسرچ اسکالروں کو بعض اوقات یہ استفسار کرتے ہوئے پایا گیا ہے کہ آیا یہ رسالہ ہے یا کتاب۔ نووارد ریسرچ اسکالر شروع شروع میں بعض اوقات یہ طے نہیں کر پاتا کہ کتاب کونسی ہے اور رسالہ کون سا ہے، اس کا شعور بعضوں کے یہاں ریسرچ کے کئی ہفت خواں طے کرنے کے بعد ہی آجاتا ہے۔ اس لئے اشاریہ میں اگر کتابوں اور رسالوں کے لئے دو الگ الگ خانے یا حصے یا عنوان مخصوص کر دئے جاتے تو بہتر ہوتا۔ اشاریہ ساز نے کئی مقامات پر کسی عنوان کے تحت سوالیہ نشان لگائے ہیں۔ مثال کے طور پر ص ۲۷ پر علامہ اقبال کا انسان کامل کے آگے مقالہ

نگار کا نام درج کرنے کے بجائے سوالیہ نشان درج ہے، حالانکہ اس کے ساتھ امروز لاہور۔۹، نومبر ۸۶ء ضرور تحریر کیا گیا لیکن جلد نمبر درج نہیں کیا گیا ہے۔ اسی طرح ص ۸۵ پر آخری مقالہ، اقبال کا تصور خودی، اور مقالہ نگار کی جگہ خلیفہ عبدالحکیم کے الفاظ تحریر کئے گئے ہیں اور اس کے آگے مقالات حکیم ضرور درج کیا گیا ہے لیکن یاد رہے کہ مقالات حکیم کی تین جلدیں ہیں اور ان تین جلدوں میں سے صرف دوسری جلد اقبالیات پر مقالات کے لئے مخصوص ہے۔ اسی طرح بعض مقامات پر کسی مضمون کے سلسلے میں رسالے کا نام، مقام اشاعت، اور سن اشاعت تو دیا گیا ہے لیکن شمارہ نمبر اور صفحہ نمبر نہیں دیا گیا ہے۔ چنانچہ محقق کو سال بھر کی اشاعتیں کھنگالنا پڑتی ہیں اور یوں تلاش و جستجو کا کام طوالت میں پڑ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ص ۸۵ پر مثنوی اسرارِ خودی کے تبصرہ نگار ڈکنسن کے آگے "معارف" اعظم گڈھ ۱۹۲۱ء ضرور تحریر کیا جا چکا ہے لیکن شمارہ نمبر اور صفحہ نمبر ندارد۔ مثنوی اسرارِ خودی کے تبصرہ نگار ڈکنسن ضرور ہیں لیکن ''معارف'' کے مذکورہ شمارے میں اس کا ترجمہ شائع کیا گیا ہے۔

ایک اور بات، وہ یہ کہ، عبداللہ صاحب کے اس جامع اشاریہ میں اگر ہندو پاک اور مغربی ممالک میں اقبال پر شائع ہوئی کتب کو بھی شامل کیا جاتا تو اس کی مزید افادیت ہوتی۔

چونکہ اشاریہ سازی کے تئیں عبداللہ صاحب کا رویہ نہایت سنجیدہ ہے اور اُنہیں خود بھی اس کا احساس رہا ہے۔ چنانچہ پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے جب اشاریہ ساز کے سامنے ''مفتاحِ اقبال'' میں مقالات اور کتابوں کو شامل کرنے کی تجویز رکھی تھی تو انہوں نے پروفیسر موصوف سے جواباً اس طرح کہا تھا:

> ''مفتاحِ اقبال کا دوسرا ایڈیشن، جو عنقریب شائع ہو رہا ہے، دو حصوں پر مشتمل ہوگا، پہلے حصے میں مقالات کا بیان ہوگا اور دوسرے حصّے میں کتابوں کا۔''[1]

اشاریہ ساز نے ''مفتاحِ اقبال'' کی نسبت اعتذارانہ کلمات تحریر کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس

۱۔ اقبالیات، شمارہ ۹، ص ۱۴۷۔

اشاریہ کو مکمل نہیں کہا جا سکتا اور قارئین کرام سے کتاب میں راہ پا گئی خامیوں اور کوتاہیوں سے مطلع کرنے کی درخواست کی گئی ہے۔ مندرجہ بالا سطور میں جن معمولی کوتاہیوں کی نشاندہی کی گئی ہے اُن کے باوجود ''مفتاحِ اقبال'' کی اہمیت اور افادیت مسلم ہے اور اسے اقبال پر تحقیق کرنے والوں کے لئے نہایت کارآمد کتاب قرار دیا جا سکتا ہے۔

''مطبوعات اقبال انسٹی ٹیوٹ'' بھی اقبال انسٹی ٹیوٹ کے لائبریرین محمد عبداللہ خاور کا ترتیب دیا ہوا توضیحی اشاریہ ہے۔ اقبالیاتی ادب میں جہاں تک توضیحی اشاریوں کی ترتیب کا تعلق ہے، اس سلسلے میں پہلا قدم پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو نے اُٹھایا ہے۔ اس شعبہ کے اہتمام سے مذکورہ شعبہ کی ایک طالبہ شگفتہ ناز نے ''تنقید اقبال کے اہم تصورات کا توضیحی اشاریہ'' کے عنوان سے ایک تحقیقی مقالہ سپرد قلم کیا ہے۔ یہ مقالہ اُردو کتابوں کے مقالات و مباحث پر مشتمل توضیحی اشاریہ ہے۔ اشاریہ میں فکرِ اقبال کے دس اہم موضوعات کو لیا گیا ہے، جو اس طرح ہیں، خودی و بے خودی، عقل، عشق، مردِ مومن، نظریۂ فن، تعلیمِ مغرب، تصوف، فقر، وطنیت و قومیت اور ذہنی ارتقاء۔ محمد عبداللہ خاور کا ''مطبوعات اقبال انسٹی ٹیوٹ'' ادارہ کی چالیس اردو مطبوعات میں شامل ۲۸۹ مقالات کا ملخص اشاریہ ہے، جو انسٹی ٹیوٹ کے اہتمام سے ۱۹۷۸ء سے لیکر کے ۱۹۹۸ء تک گزشتہ دو دہائیوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ اشاریہ میں معروف اقبال شناسوں اور کئی دیگر اہل علم کے مقالات کی تلخیص پیش کی گئی ہے۔ آفرینش سے ہی اقبال انسٹی ٹیوٹ کی اُردو مطبوعات میں جن ممتاز اقبالیین اور دیگر اہلِ فکر و نظر کی تحریریں شائع ہوتی رہی ہیں، اُن میں پروفیسر آل احمد سرور مرحوم، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، سعید احمد اکبر آبادی، پروفیسر مسعود حسین خاں، پروفیسر مرغوب بانہالی، پروفیسر قاضی غلام محمد، پروفیسر محمد عبداللہ شیدا، پروفیسر غلام رسول ملک اور پروفیسر قدوس جاوید کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ ''مطبوعات اقبال انسٹی ٹیوٹ'' میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کے اہتمام سے ۱۹۷۸ء سے ۱۹۹۸ء تک شائع کی گئی مطبوعات میں شامل تمام اہم مقالات کی تلخیص پیش کی گئی ہے۔ اشاریہ میں مقالہ نگاروں

40746

کو حروف تہجی اور مقالات کو تاریخی اعتبار سے درج کرنے کا ذکر اشاریہ ساز نے ان الفاظ میں کیا ہے:

''اشاریہ کی ترتیب میں جن باتوں کا خاص طور سے خیال رکھا گیا ہے۔ وہ یہ ہیں:

-- اشاریہ مقالہ نگار کے نام سے حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب (دیا) گیا ہے۔

-- مقالات کو تاریخی ترتیب کے تحت درج کیا گیا ہے۔''[1]

اشاریہ میں مقالہ نگار حضرات کے اسمائے گرامی کو درج کرتے ہوئے حروف تہجی کا التزام ضرور کیا گیا ہے لیکن جہاں تک مقالات کو تاریخی ترتیب کے ساتھ درج کرنے کا تعلق ہے، یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اشاریہ میں مقالہ نگاروں کے اسمائے گرامی میں حروف تہجی کا التزام کرتے ہوئے مقالات کی ترتیب زمانی بری طرح متاثر ہو چکی معلوم ہوتی ہے۔ یعنی مقالہ نگاروں کے نام حروف تہجی کے اعتبار سے ضرور درج کیے گئے ہیں لیکن مقالات کا تاریخی تسلسل برقرار نہیں رہ سکا ہے۔ مثال کے طور پر ''ن'' حرف کے تحت مقالہ نگاروں کے اسمائے گرامی کے ساتھ مقالات کی اشاعتوں کے جن سن دیے گئے ہیں وہ آگے پیچھے درج کیے گئے ہیں۔ ص ۱۵۳ پر مقالہ نمبر ۲۷۴ کے آگے جس مقالے کا عنوان درج کیا گیا ہے اُس کا سن اشاعت مارچ ۱۹۹۸ء تحریر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد مقالات کے سالِ اشاعت یوں دیے گئے ہیں۔ ۷۸، ۸۱، ۹۴، ۸۷، ۸۹، ۸۱، ۸۸، مئی ۹۷، ستمبر ۹۴، ۸۳، ۸۱ اور ۸۷ وغیرہ وغیرہ۔ اشاریہ میں ہر مقالے کا مکمل حوالہ یعنی مقالہ نگار کا نام، مقالے کا عنوان، کتاب یا رسالہ کا نام، اُس کے مصنّف یا مدیر کا نام، شمارہ اور سن اشاعت درج کیا جا چکا ہے، کوئی طویل مقالہ، جسے بعد میں کسی کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے، اُس کے آگے واوین میں ''کتابی شکل میں'' کے الفاظ تحریر کر کے اُس کے کل صفحات کی تعداد بھی درج کی گئی

۱۔ محمد عبداللہ خاور، مطبوعاتِ اقبال انسٹی ٹیوٹ، دیباچہ، ص ۱۷۔

ہے۔ اگرچہ مقالے کی تلخیص، صرف تلخیص تک محدود ہو کر اصل دستاویز کی قائم مقام نہیں ہوتی، تاہم اشاریہ ساز نے ہر مقالے کی تلخیص تحریر کرتے ہوئے مقالے میں درج تمام اہم نکات کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی ہے۔ اشاریہ ساز تلخیص کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

> ''اس سے اصل مقالے کی طرف رجوع کرنے یا نہ کرنے میں فیصلہ لینا آسان ہو جاتا ہے''۔[1]

تلخیص کی اہمیت اور افادیت سے ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا ہے لیکن تحقیق کا تقاضہ ہے کہ محقق بہر حال اصل دستاویز تک رسائی پانے کی حتی الامکان کوشش کرے۔ اشاریہ کے اختتام پر موضوعات کا اشاریہ حروف تہجی کے اعتبار سے دیا گیا ہے تاکہ مقالات کی تلاش میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ ہر عمدہ تخلیق کے پس پشت اُس کے خلق کرنے والے کا خونِ جگر شامل ہوتا ہے۔ فن کی تخلیق کے دوران فن کار کو کئی جانکاہ مراحل سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔ اس کا اندازہ قاری کو اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک نہ وہ خود تخلیقی عمل کے کرب آگیں مرحلے سے گزرے۔ بقول علامہ اقبال

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر　　نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

عبداللہ صاحب کا توضیحی اشاریہ ''مطبوعات اقبال انسٹی ٹیوٹ''، محققین کے لئے بظاہر ایک اشاریے کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن طول طویل مقالات کا بہ نظر غائر مطالعہ کرنا اور پھر ان کی تلخیص پیش کرنا واقعی دریا کو کوزے میں بند کر دینے کے مترادف ہے۔ اس دقت طلب اور صبر آزما کام میں اشاریہ ساز کی شب و روز کی محنت و مشقت کے ساتھ ساتھ اقبالیات کے تئیں اُن کی گہری دلچسپی کا اندازہ صاف طور پر لگایا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ انگریزی ادب کے ایک عالم اور اقبال پر کئی عمدہ کتابوں[2] کے مصنف پروفیسر غلام رسول ملک اس کام کو جانکارہ قرار

۱۔ دیباچہ۔ مطبوعات اقبال انسٹی ٹیوٹ۔ (عبداللہ خاور)، ص ۱۷۔

۲۔ اقبال اینڈ دی انگلش رومینٹکس، دی بلڈی ہوریزن، اے سٹڈی آف اقبالس رسپانس ٹو دی ویسٹ اور سرودِ سحر آفریں۔

دیتے ہوئے اشاریہ سازی میں عبداللہ صاحب کی مہارت کا ان الفاظ میں اعتراف کرتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے:

> ''عبداللہ خاور صاحب نے اشاریہ سازی میں جو خصوصی مہارت حاصل کی ہے اُس کا حصول دقت نظر اور محنتِ شاقہ کے بغیر ممکن نہیں۔ طول طویل مباحث اور مقالات و مضامین کا بالاستیعاب مطالعہ کرنا، ان کے مرکزی موضوعات کا تعین کرنا اور پھر ان کا جوہر نکال کر اربابِ ذوق اور متلاشیانِ علم و دانش کی خدمت میں پیش کرنا کوئی آسان کام نہیں لیکن بایں ہمہ یہ جاں کاہ کام کئی اعتبار سے خوشگوار بھی ہے اس لئے کہ جو شخص پھولوں کا عطر نکال کے ماحول کو خوشبودار بنا رہا ہو، خود اس کا مشام جاں معطر ہوئے بغیر کیسے رہ سکتا ہے۔ یہ بات خوش آئندہ ہے کہ جناب خاور صاحب نے اپنی اکیڈمک تحقیق کے لئے بھی یہی میدان منتخب کیا ہے۔۔۔ اللہ کرے کہ ان کا یہ کاروبارِ شوق برابر جاری رہے اور تشنگانِ علم کی سیرابی کا سامان کرتا رہے۔''[1]

اقبال انسٹی کے زیر اہتمام اقبال پر وقیع رسائل میں ارباب فکر و نظر، علم و دانش اور اقبال شناس حضرات کے وقتاً فوقتاً تحریر کئے گئے مضامین پر مشتمل اُردو اور انگریزی میں انتخابات ترتیب دینے کا جو پروگرام مرتب کیا گیا تھا، اُس کے تحت اب تک چار انتخابات ترتیب پا چکے ہیں۔ جو اس طرح ہیں:

۱۔ نفحاتِ اقبال (مارچ ۲۰۰۱ء) ۲۔ اقبالیات کی تجلیات (۲۰۰۲ء)

3. Iqbal's Multiformity (2001)

4. Iqbal's Idea of the Self (Feb. 2002)

۱۔ محمد عبداللہ خاور، مطبوعات اقبال انسٹی ٹیوٹ، ص ۱۰۔

ان تمام انتخابات کو اقبال انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر جناب پروفیسر بشیر احمد نحوی نے ترتیب دیا ہے۔ ''نفحاتِ اقبال'' بارہ مضامین پر مشتمل ادارہ کے اہتمام سے شروع کئے گئے مضامین کے انتخابی سلسلے کی پہلی کڑی ہے جس کے آغاز میں انتخاب کی ترتیب کے مقصد پر مرتب نے ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

> ''راقم الحروف نے 'نفحات اقبال' کے عنوان سے مستند ماہرین ادب کا ایک انتخاب ترتیب دیا ہے تا کہ شاعرِ مشرق کے فکر سے متعلق کچھ ایسی باتیں شیدایانِ اقبال تک پہنچ جائیں جن سے ابھی تک وہ نا آشنا ہیں۔''[1]

''نفحات اقبال'' میں شامل مضامین اقبال کی حیات اور شخصیت کے علاوہ اُن کی شاعری اور فکر کے کئی اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان میں اُن اقبال شناسوں کے مضامین بھی شامل ہیں جنہیں اقبال سے ملاقات کا شرف حاصل رہا ہے، مشہور و معروف اقبال شناس اور اقبال پر معرکتہ الآرا کتاب ''فکر اقبال'' کے مصنف ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے اپنے مضمون ''علامہ اقبال سے میری ملاقات'' میں اپنے ہم عصر اور مفکر شاعر علامہ اقبال سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے اُن کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ ''نفحاتِ اقبال'' میں شامل ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کا یہ مضمون اقبالیات پر مشتمل مقالات حکیم جلد دوم طبع اول ۱۹۶۹ء، جسے شاہد حسین رزاقی نے مرتب کیا ہے، میں درج ہے۔ ''نفحات اقبال'' کا چوتھا مضمون ''کلام اقبال میں عربی ادب کے تاثرات'' پروفیسر محمد منور ہی کی کتاب ''میزانِ اقبال'' کے طبع ثانی، جو اقبال اکادمی پاکستان سے ۱۹۹۲ء میں شائع ہو چکی ہے، میں پہلے مضمون کے طور پر ''کلامِ اقبال پر عربی ادب کے اثرات'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ جہاں تک اقبال کے فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال کے مضمون ''اقبال ایک باپ کی حیثیت سے'' کا تعلق ہے۔ یہ مضمون 'نفحات اقبال' کا حصہ بننے سے قبل کئی کتابوں میں شائع ہو چکا ہے۔ سید عابد علی عابد اور مولانا غلام رسول مہر کے مضامین بعنوان ''رسول پاکؐ سے محبت'' اور ''کلامِ اقبال کا حقیقی مقام'' اچھے مضامین ہیں۔ اوّل الذکر میں رسول مقبولؐ کی ذات اقدس سے اقبال کے والہانہ عشق کا ذکر کرتے

۱۔ ڈاکٹر بشیر احمد نحوی (مرتب) نفحاتِ اقبال، ص، ب۔

ہوئے اس پہلو کا غائر مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ جب کہ موخرالذکر مضمون ''کلام اقبال کے حقیقی مقام'' سے متعلق ہے۔ یہ اور اس طرح کے کئی مضامین اقبال کی حیات، شخصیت اور اُن کی شاعری اور فکر کے کئی اہم گوشوں سے بحث کرتے ہیں۔ انتخاب کے عمل کا انحصار انتخاب کنندہ کے ذوق اور ذہن پر ہوتا ہے۔ نفحاتِ اقبال میں درج مضامین کی Variety کے پیش نظر اس کی اہمیت مسلّم ہے، تاہم اقبال پر شائع شدہ مضامین کو دوبارہ منتخب کر کے اُنہیں شائع کر دینے کی بجائے اب زیادہ مفید کام یہ ہوگا کہ اقبالیات سے متعلق اُن مضامین کے انتخاب ترتیب دئے جائیں جو واقعی نادر اور نایاب ہوں، کیونکہ اب اقبالیات ایک طویل مسافت طے کر چکا ہے اور اس مرحلے پر اقبال کے تمام تر ذخیرے کو پیش نظر رکھ کر ایسا اقبالیاتی ادب پیش کیا جائے جو تکرار سے محفوظ ہو اور جس کا مطالعہ کر کے واقعتاً اقبال کے سنجیدہ قاری مستفید ہوں۔ مثال کے طور پر سوانح اقبال پر ''خدنگ نظر'' ۱۹۰۲ء کے ایک شمارے میں سر عبدالقادر کا تحریر کیا ہوا مضمون، جسے بعض محققین نے اقبال پر پہلے سوانحی مضمون کا درجہ دیا ہے، یا اقبال پر لکھی گئی غیر ملکی زبانوں میں وقیع کتابوں اور مضامین کا ترجمہ، وغیرہ وغیرہ۔

"Iqbal's Idea of the Self" کی اشاعت فروری ۲۰۰۲ء میں ہو چکی ہے۔ فاضل مرتب دیباچہ میں مقالہ اور مقالہ نگار کی نسبت اتنا ہی تحریر فرماتے ہیں:

> "This booklet entitled "Iqbal's Idea of the Self" written by Muhammad Rafiuddin Hashmi, is a noted Iqbal scholar of the subcontinent"[1]

اتنے اہم مقالے کے لکھنے والے سے متعلق مرتب کے دئے گئے اس مختصر اور ناکافی تعارف کے باعث مجھ پر اس بات کا انکشاف نہیں ہو پایا کہ یہ کون سے محمد رفیع الدین ہاشمی ہیں۔ کتاب کے سرورق پر پروفیسر محمد رفیع الدین ہاشمی کا نام گرامی تحریر کیا گیا ہے جب کہ کتابچے کے پیش لفظ میں مقالہ نگار کا اسم گرامی محمد رفیع الدین ہاشمی درج ہے۔ بقول شاعر

---

1. Dr. Bashir Ahmad Nahvi, Iqbal's Idea of the Self, Foreword, p. 3

مقالہ نگار کا صحیح تعیّن نہ ہونے کی بناء پر میں نے فاضل مرتب سے رجوع کر کے اُن سے استفسار کیا کہ یہ کون سے محمد رفیع الدین ہیں؟ اقبالیات کے طالب علم بالعموم نامور محقق ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، جو اشاریاتی ادب پر ''کتابیات اقبال'' کے نام سے بھی ایک کتاب ترتیب دے چکے ہیں، سے واقف ہیں۔ موصوف نے جواب میں فرمایا کہ پاکستان سے رفیع الدین نام کے کئی لکھنے والوں کا تعلق ہے، اور Iqbal's Idea of the Self کتابیات اقبال والے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نہیں ہیں بلکہ کوئی اور ہیں۔ ان کوئی اور کی میں نے تلاش شروع کی۔ حسنِ اتفاق سے برصغیر کے اسی نام کے ایک مشہور و معروف ماہرِ اقبالیات، اسلامی مفکر، ماہرِ تعلیم، عربی کے پروفیسر، فلسفہ پر معرکتہ الآرا کتاب "Ideology of Future" کے مصنف اور اقبال اکیڈمی کراچی کے پہلے ڈائریکٹر ڈاکٹر محمد رفیع الدین، جنہیں عالمِ دین مولانا عبدالماجد دریابادی نے اقبال کا صحیح نمائندہ قرار دیا ہے، کا ذکر میری نظر سے گزرا۔ ادھر اقبال کے مجموعۂ مکاتیب، جسے شیخ عطاء اللہ نے مرتب کیا ہے، کے حصۂ دوم میں ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے نام اقبال کا ۲۲ ستمبر ۱۹۳۲ء کا تحریر کردہ مکتوب بھی ملا، اس کے علاوہ عالم بے بدل اور اقبال کے شیدائی قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کی تصنیف ''اقبالیات کا تنقیدی جائزہ'' میں اسی عنوان کے ایک مضمون کی نسبت موصوف کی یہ رائے ملی:

> ''فلسفۂ خودی پر ایک بہترین مضمون ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ڈائریکٹر اقبال اکیڈمی کراچی کے قلم سے انگریزی میں Iqbal's Idea of the Self کے عنوان سے مجلّہ اقبال میں شائع ہوا ہے۔''[1]

قاضی موصوف نے اپنی کتاب کے حاشیے میں جو حوالہ دیا ہے اُس کی رُو سے یہ مضمون مجلّہ اقبال کی جلد اول، شمارہ ۳ بابت جنوری ۱۹۵۳ء میں ص ۱ تا ۲۸ پر شائع ہو چکا ہے۔ میرے عرض کرنے کا یہ مقصد ہے کہ ۶۴ صفحات پر مشتمل فاضل مرتب کے ترتیب دیے گئے اس

۱۔ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی، اقبالیات کا تنقیدی جائزہ، ص ۱۲۹۔

اہم مقالے کی ابتداء میں مقالہ نگار سے متعلق چند ضروری معلومات فراہم کرنا لازم تھا تا کہ اُن کے علمی اور فلسفیانہ کارناموں کا ایک اجمالی نقشہ قارئین کے سامنے آجاتا۔ نیز مؤلف مقالے کے ماخذ پر بھی مہر بہ لب ہیں، جب کہ ماخوذ مضامین کے اصل سورس کا حوالہ دینا کسی بھی طرح سے نامناسب اور غیر ضروری نہیں بلکہ ادبی دیانت کے اقتضاء کے عین مطابق ہے۔ بہر حال مقالے میں اقبال کے تصور خودی سے جس عالمانہ انداز میں بحث کی گئی ہے وہ قابل ستائش ہے اور میرا خیال ہے کہ اقبال کے تصور خودی پر کام کرنے والے جن اقبال شناسوں نے اُن کی شاعری کے اس اساسی اور مرکزی تصور کی تفہیم میں کامیابی حاصل کی ہے، اُن میں پروفیسر محمد رفیع الدین کا نام بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مؤلف نے کتابچے کی ترتیب کے مقصد پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ مذکورہ مقالے کی اشاعت کے پس پشت یونیورسٹی کے طلباً بالخصوص سائنس اسٹریم سے تعلق رکھنے والے اُن طالب علموں کی خواہش کارفرما ہے، جو تصور خودی سے متعلق اقبال کے افکار سے آگہی حاصل کرنے کے خواہاں ہیں، مؤلف نے اس نوع کی اشاعتوں سے نہ صرف طالب علموں بلکہ عام لوگوں تک اقبال سے متعلق واقفیت بہم پہنچانے کا مقصد ظاہر کیا ہے۔ گویا اس انتخاب کا مدعا اقبال کے افکار و خیالات کو عام لوگوں تک پہنچانا ہے، جو نہ صرف اقبال انسٹی ٹیوٹ کے قیام کا مقصد ہے بلکہ علامہ اقبال کی آرزو بھی ؎

خدایا آرزو میری یہی ہے　　میرا نورِ بصیرت عام کردے

اس اعتبار سے یہ کوشش لائقِ استحسان ہے، تاہم انتخاب کی ریڈرشپ کو مزید وسعت دینے کی خاطر اگر اس میں اقبال کے تصور خودی سے متعلق چند اور ماہرین اقبالیات کے مضامین اور خودی کی نسبت اقبال کے تصورات، جن کا اظہار اُنہوں نے اپنی نثری تحریروں میں مختلف مقامات پر کیا ہے، کو بھی شامل کیا جاتا تو کتاب کا حجم بڑھ جانے کے باوجود اس کی افادیت میں مزید اضافہ ہوتا۔

انگریزی میں تحریر کیے گئے شرق و غرب سے تعلق رکھنے "Iqbal's Multiformity"

والے ماہرین اقبالیات اور اربابِ فکر و نظر کے تیرہ مضامین پر مشتمل وہ انتخاب ہے جن میں سے بیشتر مضامین کو مرتّب نے پاکستان سے شائع ہونے والے وقیع رسالہ ''اقبال ریویو'' سے ماخوذ بتایا ہے۔ ان میں علامہ کی شاعری اور فکر کے مختلف اور اہم پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے۔ انتخاب میں فلسفہ کے ممتاز پروفیسر ایم۔ ایم۔ شریف کے دو مضامین اقبال کے نظریۂ حسن اور اقبال کے نظریۂ فن کے عنوانات کے تحت ہیں۔ ایک مضمون اطالوی مستشرق پروفیسر ایلیہ ساندرو بوزانی کا "The Life and Works of Iqbal" کے عنوان سے ہے۔ پروفیسر بوزانی نے اقبال کی مشہور فارسی تصنیف ''جاوید نامہ'' کا اطالوی زبان میں جو نثری ترجمہ کیا ہے، وہ ۱۹۵۲ء میں روم سے "Il Poems Celeste" کے نام سے شائع ہوا۔ ترجمے پر پروفیسر بوزانی نے جو تعارف تحریر کیا ہے، Iqbal's Multiformity میں شامل پروفیسر موصوف کا مضمون اسی کا انگریزی روپ ہے۔

''اقبالیات کی تجلّیات'' کے نام سے یہ انتخاب ۲۰۰۲ء میں شائع ہو چکا ہے۔ یہ ایک سو اٹھاون (۱۵۸) صفحات پر مشتمل سات مضامین کا انتخاب ہے۔ پیش لفظ پروفیسر بشیر احمد نحوی کا تحریر کیا ہوا ہے۔ اس انتخاب میں چند اہم اور عمدہ مضامین شامل ہیں، جیسے مطالعۂ رومی کی تاریخ میں اقبال کا مقام، فلسفۂ وجودیت اور اقبال، اقبال کی دانش نورانی اور حالی اور اقبال کے مقاماتِ آہ و فغاں، اقبال کی تجلّیات کے عنوان سے اس انتخاب کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ اس میں بعض ایسے اقبال شناسوں کے مضامین بھی شامل ہیں جنہوں نے اقبال پر قابل قدر کام کیا ہے اور اقبال کی شاعری اور فکر کے اُن پہلوؤں کو لیا ہے جن پر زیادہ تر اظہار خیال نہیں کیا گیا ہے۔

بحیثیت مجموعی ان چاروں انتخابات میں مرتب کی محنت شاقہ کا خاصا عمل دخل ہے، اقبال پر تحریر کئے گئے مقالات کے وافر ذخیرہ میں سے چند مضامین کے انتخاب ترتیب دینا، اُنہیں خوبصورتی کے ساتھ کمپوز کرانا، اُن کے پروف صحیح کرنا اور پھر اُن کی طباعت وغیرہ۔ ان تمام مراحل سے مرتب کا گزرنا نہ صرف اقبالیات کے تئیں اُن کے غیر معمولی شغف بلکہ

اقبال کے نورِ بصیرت کو عام کرنے کی بھی بڑی حد تک ضمانت فراہم کرتا ہے۔ چنانچہ پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور پروفیسر حامدی کاشمیری جیسے اقبال شناسوں نے نفحاتِ اقبال اور Iqbal's Multiformity کو پسند فرما کر انہیں اقبالیاتی ادب کے لئے انتہائی نیک شگون قرار دیا ہے، اور اس نوع کے مزید انتخاب ترتیب دے کر انہیں منظرِ عام پر لانے کی ضرورت محسوس کی۔ بقول خدائے سخن میر تقی میر ؎

سرسری تم جہاں سے گزرے ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

فاضلؔ کاشمیری کی شاعری پر اقبال کے اثرات

حکیم الامت علامہ محمد اقبالؔ کی شاعری نے جہاں اُردو شعر و ادب کو متاثر کیا ہے وہاں کشمیری شعراء نے بھی اس عظیم شاعر اور مفکّر کے گہرے اثرات قبول کر کے اس زبان کے شعری سرمائے میں گرانقدر اضافہ کیا ہے۔ اقبال کا شمار دُنیا کے عظیم شعراء میں ہوتا ہے۔ کسی فن کار کی عظمت کا معیار یا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اُس کی شاعری کسی مخصوص خطے یا ملک و قوم تک محدود نہیں ہوتی بلکہ یہ زماں و مکاں کی حدود و قیود کو پھلانگ کر تمام بنی نوع انسان کا احاطہ کرتی ہے۔ اُس کی بنیاد عالمگیر صداقت پر مستحکم ہوتی ہے۔ اقبال انہیں عالمگیر صداقتوں کے شاعر ہیں، اُن کا پیغام بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ اسی سبب کے تحت اُنہیں ہر زمانے اور ہر زبان کے ادب میں ہمیشہ مقبولیت حاصل رہے گی۔

کشمیری زبان کے شعری سرمائے پر ایک نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید ہی اس زبان کا کوئی ایسا باکمال شاعر ہو جسے اقبال کی شاعری نے کسی نہ کسی اعتبار سے متاثر نہ کیا ہو۔ یہ اثرات کشمیری شعراء کے یہاں مختلف صورتوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ کہیں خیالات مستعار لئے گئے ہیں، کہیں اُن کا رنگ سخن اختیار کرنے کی کوشش کی گئی ہے، کہیں اُن کی غزلیات، منظومات اور رُباعیات کا جستہ جستہ اور کہیں پورے پورے شعری مجموعوں کا کشمیری زبان میں ترجمہ کیا جاچکا ہے اور کہیں اُنہیں خراج تحسین اور خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ ان تمام عوامل میں کشمیری شعراء کس حد تک کامیاب ہو چکے ہیں، یہ ہمارے موضوع پر شامل نہیں، تاہم یہ بات بڑے ہی وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ کشمیری شعراء پر بیسویں صدی کے اوائل میں اقبال کے اثرات مرتسم ہونا شروع ہو چکے تھے۔

خطۂ کشمیر کو اقبال جیسے مایہ ناز فرزند کا آبائی وطن ہونے کا شرف حاصل ہے۔ یہاں کے فطری حسن سے دلچسپی رکھنے کے ساتھ ساتھ اُنہیں یہاں کے مظلوم اور محکوم عوام سے خاصی ہمدردی رہی ہے۔ ایک زمانے میں جب کشمیری قوم غلامی کی آہنی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی، تو ان کے غم خوار، ہمدرد اور انسانی آزادی کے حقیقی علمبردار علامہ اقبال نے انہیں بیداری کا پیغام دیا۔ چنانچہ اس عظیم شخصیت کی ذاتِ گرامی کے تئیں اہلِ کشمیر کی عقیدت وارادت بعض اوقات وارفتگی کی حدوں کو چھوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ کشمیر کے تقریباً ہر بڑے شاعر نے اُنہیں خراج تحسین پیش کیا ہے اور اس باکمال شخصیت کی بنی نوع انسان اور اہلِ کشمیر کے تئیں خدمات کے اعتراف میں کشمیر کے کئی تعلیمی ادارے، سرکاری عمارات و مقامات اور نجی تجارتی مراکز موصوف کے نامِ گرامی سے منسوب ہیں۔

غلام احمد فاضل کاشمیری کشمیری زبان وادب کی وہ Living Legend ہیں جنہوں نے اس زبان کے شعر وادب کو اپنی چھوٹی بڑی منظوم اور منثور تقریباً دو درجن سے زاید تصانیف کے بیش قیمت اور وافر سرمائے سے مالا مال کیا ہے۔ اُن کی شاعری کی بوقلمونی اور رنگارنگی کے پیش نظر اُنہیں کشمیر کا نظیر اکبر آبادی، رس خان، ورڈس ورتھ اور محسن کاکوروی کے خطابات سے نوازا جاچکا ہے۔ موصوف کی شاعری میں موضوعات کی وسعت اور تنوع کے ساتھ ساتھ زبان و بیان پر غیر معمولی دسترس کو ملحوظ نظر رکھ کر انہیں کئی اعزازات عطا کئے گئے ہیں۔ اُنہوں نے کم عمری میں شعر گوئی کا آغاز کیا ''نغمہ زار اور ساز چمن (کشمیری) میں درج کلام اُن کے ابتدائی زمانے کی مشق کے نمونے ہیں۔ دسویں جماعت تک آتے آتے اُن کا پہلا شعری مجموعہ اُردو میں ''گلدستۂ فاضل'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس مجموعے کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے شعری سفر کے ابتدائی زمانے ہی سے اُن کی نگاہیں رہ رہ کر کسی ایسے پختہ کار اور اعلیٰ پائے شاعر کو تلاش کر رہی تھیں جن کے تخلیقی کارناموں کی عظمت سے متاثر ہو کر وہ شعر کے میدان میں اپنا ایک مخصوص اور منفرد مقام پیدا کریں۔ وہ اقبال کے پہلے مجموعۂ کلام اُردو بانگِ درا سے خاص طور سے متاثر ہیں۔ اُنہوں نے خود بھی

اپنی شاعری پر اقبال کے اثرات کا اعتراف کیا ہے۔ ''بانگ درا'' کو اُنہوں نے شروع سے حرزِ جاں بنائے رکھا، اُن کے نزدیک اقبال ایک ایسے شاعر ہیں جن کی ہمسری کوئی نہیں کرسکتا۔ فاضل صاحب کی شاعری کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کے اثرات اُن کے رگ وپے میں رچ بس گئے ہیں۔ لہجے کی توانائی، اعتماد کے ساتھ بات کہنے کا سلیقہ، جوش وخروش، تاثیر، انسان دوستی، انسان کی سیرت وکردار کی بہتر تعمیر وترقی وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام عناصر فاضل صاحب کی شاعری میں پہلو بدل بدل کر سامنے آتے ہیں۔ گلدستۂ فاضل میں درج منظومات، غزلیات، نعتیں اقبال کے تتبع میں کہنے کے علاوہ اس مجموعے میں خامۂ اقبال اور جنازۂ اقبال کے عنوان سے دو نظمیں شامل ہیں۔ ذیل میں یہ دونوں نظمیں درج کی جاتی ہیں[1]۔

دیکھ اے مستِ غلامی دیدۂ ہندوستاں
پاک روحوں کا سفر ہوتا ہے سوئے آسماں

تجھ کو غیروں سے ہے اُلفت اور اپنوں سے حسد
اور اپنے جسم کے ان ہاتھ پاؤں سے حسد

کیا ترے سینے میں جوشِ زندگی باقی نہیں
غیر کے ہاتھوں میں آکر ڈوب مرنا ہے کہیں

اُٹھ گئے وہ جن سے حاصل تھا تجھے اک امتیاز
اور دب جاتا تھا جن سے تیری بربادی کا راز

دیکھ تیری ہستی اقبال زیب دوش ہے
عالمِ اسلام کا ہر ذرّہ حسرت پوش ہے

(جنازۂ اقبال)

خلعۂ اقبال نازاں تجھ پہ ہے سارا جہاں
فطرتِ انساں کا ہے تو سراسر ترجماں

ہے صریرِ نو میں تیرے وہ سرودِ دلنواز
محو ہوجاتے ہیں جس کو سنتے ہی نغمہ طراز

۱۔ ان میں سے ایک نظم اُنہوں نے ۱۹۳۸ء میں یومِ اقبال کے موقعے پر منعقد کیے گئے ایک مشاعرے میں (جو سرینگر کے ٹنڈیل بسکو میموریل اسکول میں منعقد کیا گیا تھا) سنائی تھی۔ مشاعرے میں ریاست اور بیرونِ ریاست کے کئی شعرائے کرام نے شرکت کی تھی، جن میں قیس شیروانی، لاگت جموی، دینا ناتھ مست، روش صدیقی، عبدالمجید سالک اور حفیظ جالندھری کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ فاضل صاحب کے بیان کے مطابق نظم پر اُنہیں (فاضل صاحب کو) دادِ تحسین سے نوازا گیا تھا۔ مشاعرے کی صدارت اقبال کے ایک کشمیری دوست اور علم دوست شخصیت منشی سراج الدین نے کی تھی۔

ہے ثریا سے بھی بالاتر ترا رہوارِ خیال — کہکشاں چھولے اسے کیا تاب اس کی کیا مجال
تو نے وابستہ کیا انجام سے آغاز کو — کردیا افشا طلسم کن فکاں کے راز کو
تو ہے دنیائے تخیل کا حقیقی حکمران — پھوٹ نکلے سازِ دل سے نغمہ ہائے جاوداں
روح پرور نغمہ وہ پیدا دمِ تحریر ہے — عالمِ امکاں کے لب پر نعرۂ تکبیر ہے
تو نے لیلائے سحر کو بخش دی تابندگی — تو نے شامِ موت کو دیدی ہے صبحِ زندگی
تیرے سینے سے اُبلتا ہے وہ دریائے رواں — جس کا ہر قطرہ ہے گویا اک محیطِ بیکراں
چاند تارے جڑ دیئے تو نے جبینِ خاک پر — اور گل بوٹے بنائے دامنِ افلاک پر
نور افشانی ہے تیری چاندنی تجھ پر نثار — طورِ سینا بن گئی تیری جبینِ زر نگار
لب کشائی میں ہیں پنہاں نغمہ ہائے ساربان — چشمِ حق بیں میں ہے تو پیغمبرِ ہندوستان
تو جہانِ رنگ و بو کا ہے حقیقت آشنا — فیض سے تیرے یہ فاضل شاہدِ قدرت بنا
سرمدی لے میں ترانے عشق کے گاتا ہے اب — نورِ آزادی وطن میں اپنے پھیلاتا ہے اب
اب یہی دل کی تمنا ہے یہی دل کی لگن — پنجۂ اغیار سے آزاد ہو میرا وطن

(خامۂ اقبال)

کشمیری زبان میں فاضل صاحب کی شعر گوئی کا آغاز اور پھر کچھ وقت کے بعد اُردو زبان کی طرف اُن کا رجوع ہونا ایک غور طلب بات ہے۔ اس کے پس پشت جو ایک بڑا محرک کارفرما رہا ہے وہ یہ کہ اقبال کی شاعری اور پھر اُن کے لب ولہجہ نے اُنہیں اس قدر متاثر کیا کہ اُنہوں نے نہ صرف یہ کہ اُردو زبان کو اپنے مافی الضمیر کے اظہار کا وسیلہ بنایا بلکہ اقبال کا تتبع بھی کیا۔ کسی بڑے شاعر کا تتبع کرنا کافی نہیں ہوتا بلکہ اُس کا تتبع کرتے ہوئے اپنی مخصوص انفرادیت قائم کرنا، جس سے اُس کی شناخت کی جائے، اہم بات ہے۔ ''گلدستۂ فاضل'' کی اشاعت کے بعد فاضل صاحب نے دوبارہ اپنی مادری زبان کشمیری کی طرف مراجعت کی۔ دراصل یہ انسان کی مادری زبان ہی ہے جو اکثر اوقات دوسری زبانوں کے مقابلے میں اُس کے مافی الضمیر کا بھرپور ساتھ دے سکتی ہے۔ فاضل صاحب نے اُردو سے اپنی

پٹڑی بدل کر (حالانکہ وہ اُردو میں لکھتے تو اس میں بھی ایک مخصوص مقام پیدا کر سکتے تھے) کشمیری زبان کو اپنے خیالات کے اظہار کا وسیلہ بنایا، لیکن اقبال کے اثرات اُن کی شاعری میں اس طرح جاری وساری ہیں جس طرح لہو انسان کی رگوں میں دوڑتا پھرتا ہے۔ انسان کے اندر عزم و استقلال پیدا کرنے، اُسے اشرف المخلوقات کا احساس دلانے، انسانیت دوستی، اخوت، بھائی چارہ، مساوات، فطرت سے لگاؤ، ہر مذہب کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھنے، زندگی کی تلخ حقیقتوں سے برسرِ پیکار ہو کر پامردی کے ساتھ اُن کا مقابلہ کرنے، بچوں کی اخلاقی تربیت وغیرہ وغیرہ۔ یہ ایسے موضوعات ہیں، جو فاضل صاحب کی شاعری میں مختلف صورتوں میں در آئے ہیں۔ اقبال نے اپنے پہلے اُردو مجموعۂ کلام بانگ درا (۱۹۲۴ء) کے ابتدائی حصے میں بچوں کے لئے کہی گئی نظموں (جن میں سے کئی ٹینی سن، لانگ فیلو، ایمرسن اور ولیم کوپر سے ماخوذ اور ترجمہ کی گئی ہیں) کے ذریعے اُن کی سیرت و کردار کی تعمیر کرنے کی سعی کی ہے۔ اگرچہ اس نوع کی نظموں کی تعداد کم ہی ہے تاہم ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے (ان میں در آئے کئی نکات اقبال کے یہاں بتدریج ارتقاء پا کر بعد میں مکمل کانسپٹ کی شکل اختیار کر گئے) فاضل صاحب ایک مثالی استاد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک شاعر بھی ہیں۔ چنانچہ بچوں کی فطرت، اُن کی نفسیات، جذبات، احساسات، خواہشات اور آرزوؤں کا نہایت قریب سے مطالعہ اور مشاہدہ کرنے میں اُن کی حیات کا ایک کثیر حصہ صرف ہو چکا ہے۔ بچوں کے لئے تخلیق کئے گئے ادب میں جہاں اُن کے قریبی مشاہدے، مطالعے اور تجربات کو دخل رہا ہے وہاں اقبال کی بانگِ درا کی ابتدائی نظموں (جو بچوں کے لئے کہی گئی ہیں) سے بھی وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے ہیں۔ ایک مثالی مدرس اور حساس شاعر ہونے کے ناطے اُنہوں نے اسکولی بچوں کے لئے صبح کی دُعاؤں پر مشتمل پرائر بک (جو بعد میں مزید اضافوں اور ترامیم کے ساتھ دُعائے صبح کے نام سے شائع ہوئی) لکھی ہے، جس میں مندرج دعائیں مدراس میں زیرِ تعلیم بچے ایک طویل عرصے سے اُسی طرح پڑھتے چلے آرہے ہیں جس طرح اقبال کی نظم (بچے کی دعا)

لب پہ آتی ہے دُعا بن کے تمنا میری زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

پڑھی جاتی رہی ہے۔ اقبال کی اس نظم میں بچہ خدا سے اپنی تمناؤں کا اظہار کرتا ہے کہ اُس کی زندگی شمع کی مانند روشن ہوتا کہ دُنیا پر مسلط ظلمت کافور ہو کر ہر جا روشن ہو جائے۔ اُس کے دم سے وطن کی زینت قائم رہے۔ بچے کو علم کا پتنگہ بننے کی آرزو ہے۔ وہ اپنی زندگی غرباء کی اعانت، دردمندوں اور ضعیفوں سے الفت کے لئے وقف کر دینے کی تمنا دل میں لئے ہوئے ہے۔ آخر میں بچہ اللہ سے ہر طرح کی برائی سے محفوظ رکھنے اور صراطِ مستقیم پر چلانے کی دُعا کرتا ہے اور اس طرح بچے کی دُعا اختتام کو پہنچتی ہے۔ فاضل صاحب کی بچوں کے لئے کہی گئی مارننگ پرائر (دُعائے صبح) کی ایک دُعا بعنوان "اے مالکِ زمانہ" کے پہلے چار بندوں میں خدا کا اس دنیا کے مظاہر کا مالک ہونے، ہر جا اسی کے ذکر، اُسی کی مہربانیوں، اُسی کی بندگی اور اسی کو مختلف ناموں سے پکارے جانے کا بیان ہے۔ پانچویں بند میں بچہ خدا سے زندگی میں پھولوں کی بہار لانے، اچھے اچھے کام کرنے، اپنے کشمیر سے محبت کرنے اور پھر حیاتِ جاودانی حاصل کرنے کی آرزو اور دُعا کرتا ہے کہ میں ایک بچہ ہوں، مجھے علم کے زیور سے آراستہ و پیراستہ کر دے۔ مجھے کبھی بھی کسی کمی کا احساس نہ ہو، فاضل اپنی آرزو لے کر تیری بارگاہ میں حاضر خدمت ہوا ہے، وہ بطور ایک سائل کے تیری بارگاہ میں دُعاؤں کی اجابت کا خواستگار ہے۔ اے اللہ تیری رحمت پر جوش ہے، تو مہربان ہے۔ یہ ایک عام دُعا ہے لیکن جیسے جیسے اُن کی دوسری دعاؤں کا قاری مطالعہ کرتا ہے۔ فاضل صاحب بتدریج ارتقاء کے مرحلوں سے گزرتے معلوم ہوتے ہیں اور اقبال کے اثرات اُن پر اور زیادہ گہرے ہونے لگتے ہیں۔ اُن کی ایک اور دُعا "دوبار دِکھنا" (کاش تو پھر سے دے دے) میں بچے کی آرزوں اور تمناؤں کا اظہار کیا گیا ہے لیکن بچے کو کسی ایسی منزل کے دوبارہ عطا کئے جانے کی آرزو ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے پہلے بھی نوازا ہے، شاید اُسے کھو دینے کا احساس دل میں لے کر وہ دوبارہ خدا سے اُسی منزل سے نوازے جانے کی دُعا کرتا ہے، بچہ پروردگار عالم سے اُن گنج ہائے گرانمایہ کے لئے طالب دُعا ہے جنہیں حضور

حق نے اپنے پاس محفوظ کر رکھا ہے۔ اگلے اشعار میں طلب کیے گئے خزانوں کی حقیقت قاری پر واہونے لگتی ہے جب بچہ اپنی جھولی میں دونوں عالم کو سمیٹ لینے اور ستاروں پر کمندیں ڈالنے کا آرزومند دکھائی دیتا ہے۔ اُس کے دل میں دونوں عالم کو مسخر کرنے کی تمنا انگڑائیاں لے رہی ہے۔ اُسے کوہِ طور کے اُس منظر کی دید کی خواہش ہے جس کے مقابلے میں برق سینا کی کوئی حیثیت نہ ہو بلکہ حضرت موسیٰؑ بھی جس کا مشاہدہ کر کے محوِ حیرت ہو جائیں، آگے چل کر بچہ نہایت عجز کے ساتھ اللہ سے اعانت کی درخواست کرتا ہے کہ اے اللہ! میں نے اپنی حیات کی شکستہ کشتی تمہارے بحرِ بیکراں میں ڈال دی اب اس کی رہنمائی ایک ایسی منزل کی جانب ہو، جہاں تک کسی کی رسائی نہ ہو، علم کو پتنگ سے تعبیر کرتے ہوئے بچہ خدا سے ملتجی ہے کہ ڈور نصیب ہونے کی صورت میں، میں علم کے اس پتنگ کو آسماں سے بھی اونچا اُڑا دوں۔ نمرود کا دعویٰ خداوندی حضرت جبرئیل نے توڑ کر رکھ دیا۔ اے آتشِ عشق! مجھے حق وصداقت کی دولتِ بے بہا عطا ہو۔ غالباً یہی وہ گنجینۂ بے بہا ہے جس کے حصول کی بچے کو آرزو ہے۔ آگے چل کر بچہ اُن رفعتوں کو حاصل کرنے کی دُعا کرتا ہے جو سکندر کو بھی حاصل نہ ہوئی ہوں۔ اے اللہ! مجھے دوبارہ اُن منزلوں سے ہمکنار کر جنہیں میں فراموش کر چکا ہوں۔

اقبال کی نظم میں بچے کی جن آرزوں اور تمناؤں کا اظہار کیا گیا ہے، وہ بچے کی سوچ اور فکر سے قریب تر ہیں جب کہ فاضل صاحب کی دعائیہ نظم میں بچہ خدا سے جن تمناؤں اور آرزوں کا اظہار کرتا ہے، اُس کا کچھ حصہ اُس کی معصوم سوچ وفکر سے زیادہ کسی بڑے ذی شعور انسان کی سوچ اور فکر سے بہت قریب معلوم ہوتا ہے۔ اقبال کی نظم میں بچے کی فطرت اور نفسیات کے مطابق اُس کی چھوٹی چھوٹی معصوم تمنائیں ہیں لیکن فاضل صاحب کی نظم میں بچہ کی تمنائیں اور آرزوئیں بچے کی کم اور کسی ذی شعور انسان کے ذہن رسا کی اور بالیدہ فکر کی پیداوار معلوم ہوتی ہیں۔ دراصل فاضل صاحب بچوں کی فطرت اور نفسیات کی عکاسی کرتے کرتے اپنی فطرت اور نفسیات کی بھی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس لئے ان کی

اس نوع کی دعائیہ نظموں کو نہ صرف بچوں تک محدود رکھا جاسکتا ہے بلکہ انہیں بڑوں کے لئے بھی کارآمد قرار دیا جاسکتا ہے۔ انگریزی ادب کے ایک پروفیسر اور کشمیری زبان کے ادیب پروفیسر پی، این، پشپ نے اُنہیں موضوع کے اعتبار سے شاعر طفولیت قرار دیا ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فاضل صاحب نے بچوں کے لئے مارننگ پرائر کے علاوہ ۲۴ منظوم کہانیاں تخلیق کی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے اُن کا اس نوع کا ادب طفولیت اور بلوغیت کا ایک حسین اور حیرت انگیز امتزاج ہے۔ اُن کے یہاں بچے کی معصوم کیفیت کی آئینہ داری کے پہلو بہ پہلو سنجیدگیٔ فکر اور پختگی کے کئی انداز ملتے ہیں۔ اُردو اور کشمیری زبانوں میں بچوں کے ادب کے فقدان کی شکایت کی گئی ہے، تاہم اقبال نے اُردو میں بچوں کے ادب کی جو روایت قائم کی ہے (اور بھی بہت سے اُردو شعرا نے بچوں کا ادب تخلیق کیا ہے) فاضل صاحب نے اُس روایت کی نہ صرف پاسداری کی ہے بلکہ اُس میں توسیع بھی کی ہے۔ اسی طرح بہ چانس کائناتس (میں تیری کائنات۔۔۔) کے زیرعنوان دُعا میں بچہ اس جہاں کی سیاحت کا جذبۂ بے اختیار دل میں لئے کتاب زیست کا بے خوف وخطر ہوکر والہانہ انداز میں مطالعہ کرنے کا متمنی ہے۔ وہ خود کو خضر، سکندر اور زمانے کا جواں سال رہبر قرار دے کر راستے میں آنے والے سات سمندروں کو بھی پار کرنے کا عزم صمیم کئے ہوئے ہے۔ اُس کے ارادوں میں پختگی ہے، اُس کے جذبے جواں ہیں، افلاک کی رفعتوں کی کیا بات ہے، انسان ان رفعتوں سے بھی رفیع تر ہے، اقبال عظمت انسان کے قائل ہیں اور فاضل صاحب کے نزدیک بھی انسان افلاک کی رفعتوں سے بھی رفیع تر ہے۔ ان کوہ و بیاباں سے وہ بالکل خائف نہیں۔ اس دُعا میں بچے (انسان) کی غیر معمولی استعداد اور خوابیدہ امکانات، جو اُسے خدائے لم یزل کی طرف سے ودیعت کئے گئے ہیں، کا احساس ہوتا ہے۔ یہ انسان اس جہاں کا جام جم ہے۔ اُس کے اندر ایک ایسی قوت پنہاں ہے جس کی بدولت اُس کی جبینِ ناز پر وہ تقدیر رقم کی جائے کہ وہ آفتاب کی مانند روشن ہوجائے۔ عظمت انسان کا یہ تصور اقبال اور فاضل صاحب دونوں کے یہاں ملتا ہے۔ لیکن دونوں کا اسلوب اور

انداز جداگانہ ہے۔ اقبال کے نزدیک

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہ کامل نہ بن جائے

یا

فروغِ خاکیاں از نوریاں افزوں شود روزے زمین از کوکب تقدیر ما گردوں شود روزے

اقبال کے نزدیک انسان نائب حق ہے، خلیفتہ الارض ہے اور انسان کی نیابت اور خلافت کا تصور انہوں نے قرآن کریم سے اخذ کیا ہے۔ دُعا کے آخری دو بندوں میں اپنے وطن کے تئیں بچے کے جذبۂ محبت کا ذکر بھی آیا ہے جب وہ خدا سے یہ دُعا کرتا ہے کہ میرے وطن کی بہار سدا قائم و دائم رہے اور اس کا مشاہدہ کر کے گلستان بھی فرطِ مسرت سے جھوم اُٹھیں۔ اس کے بعد وطن کو بلند و بالا رتبہ عطا کرنے اور فقط اسی پر مر مٹنے کی خواہش ظاہر کی گئی ہے۔ بچوں کے لئے لکھی گئی دُعائیہ نظموں میں شانِ ایزدی اور اُس کی عظمت کا رہ رہ کر ذکر کیا گیا ہے، وہ ہر جا موجود ہے، ہر ذرے میں اُسی کا ظہور ہے، وہی رحیم و کریم، خالق و مالکِ کل ہے۔ اُسی کا نام مندروں، مسجدوں اور گرجوں میں گونج رہا ہے۔ ہر پھول میں اُس کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔ گل اور خار دونوں اُسی کے ہیں۔ تمام انسان، حیوانات اور نباتات اُسی کی مخلوق ہیں۔ فاضل صاحب شانِ ایزدی کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں لیکن کبھی کبھی اقبال کی طرح خدا سے شوخی پر بھی اُتر آتے ہیں اور اس میں اُنہیں ایک خاص لطف محسوس ہوتا ہے۔ نظم ''نعوذ باللہ'' میں کہا گیا ہے کہ اے خدا! اب تو مجھ سے گناہ سرزد ہو چکا لیکن تم نے میری مزاحمت نہ کی۔ میں اپنی خطا کا معترف ہوں لیکن تیری بھی اس میں ایک خطا ہے، میں متعدد بار تیرے سامنے سربسجود ہوا، تم نے مجھے عبادت کرنے کے لئے کہا۔ مان لیا کہ تیرے سامنے میرے سربسجود ہونے میں میری ایک حاجت پنہاں تھی لیکن تم بھی نعوذ باللہ میرے سر بہ سجود ہونے کے لئے حاجت مند ہو۔

اقبال اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں وطنیت کے قائل تھے اور اسی کے زیر اثر اُنہوں نے ہندوستان میں فطرت کے نظاروں پر نظمیں لکھی جیسے ہمالہ، گل رنگیں، ایک آرزو، اور ابر

کوہسار وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اُنہوں نے بعد میں انسان کو فطرت پر مسخر ہونے کا مشورہ دیا کیونکہ یہ کائنات اُسی کے لئے خلق کی گئی ہے اور انسان کو اس زمین پر اللہ کے نائب کی حیثیت حاصل ہے۔ جہاں تک فاضل صاحب کی شاعری میں فطرت نگاری کا تعلق ہے، اُن کی منظومات میں فطرت کے حسین مرقعوں کی تصویر کشی کے نہایت عمدہ نمونے کثرت سے ملتے ہیں۔ کشمیر کا خطہ اپنی خوبصورتی کے اعتبار سے بے مثال ہے جب ہی تو اسے فردوس بر رُوئے زمین کہا گیا ہے۔ یہاں کے سر بفلک پہاڑوں، لہلہاتے کھیتوں، سرسبز اور شاداب درختوں، رنگ برنگے خوب صورت پھولوں، جھومتی گاتی ندیوں، نالوں، آبشاروں، جھرنوں اور دریاؤں، چہچہاتے پرندوں، سرسراتے پتوں، سرمئی اُجالوں، چمپئی اندھیروں، روپہلے بادلوں، دھان کے سنہرے کھیتوں وغیرہ وغیرہ کا ذکر بڑے حسن وخوبی کے ساتھ ان کی منظومات میں در آیا ہے۔ فاضل صاحب کے یہاں فطرت نگاری کے کئی انداز ملتے ہیں۔ بعض نظموں میں خالص حسن فطرت کی مرقع کشی کی گئی ہے۔ جب کہ بعض میں فطرت کی تعریف وتوصیف کے ساتھ اور بھی پہلوؤں کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس قبیل کی نظموں کا مقصد کچھ اور ہوتا ہے اور ان نظموں میں فطرت کے مناظر اور مظاہر کو Supporting element کی حیثیت سے بروئے کار لایا گیا ہے۔ ان کی پیشکش کے پس پشت شاعر کا مقصد عوام کی بیداری یا کچھ اور ہوتا ہے۔ نظم ''شالہ مار نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا'' کے ابتدائی بند میں ہمالہ کے حسین جھیلوں اور دریائے جہلم کے آب رواں کا ذکر ملتا ہے، جو اپنی روانی کے اعتبار سے دمکتی چاندی یا سیماب ہے اور جس سے یہاں کے کھیت، گلستان، کیاریاں اور زمینیں سیراب ہوتی ہیں، شاعر نے اسے خواب فردوس سے تعبیر کیا ہے۔ نظم کے دوسرے بند میں فطرت کے حسین اور دلفریب مناظر کی حسین پیرائے میں مرقع کشی کی ہے لیکن تیسرے بند میں دفعتاً شاعر کے لہجے میں تغیر رونما ہوتا ہے اور شاعر کشمیر میں رائج خواجگی اور زیلداری نظام کے خلاف، جو یہاں کافی عرصے سے محنت کش عوام کا خون چوس کر اُن کا استحصال کرتا آیا ہے، اہلِ کشمیر کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے اور اُنہیں

علم بغاوت بلند کرنے پر آمادہ کر دیا ہے، جب وہ اہلِ کشمیر کو غلامی کی آہنی زنجیروں میں جکڑا ہوا پاتا ہے تو استحصالی قوتوں کے خلاف انہیں شدید ردِ عمل کا اظہار کر کے عوام کو ان سے نبرد آزما ہونے کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ کشمیری عوام کی بیداری کا خواہاں ہے اور اُن کی دلی مسرت اور ذہنی آسودگی اور ترقی کا متمنی ہے، اُسے ہرگز یہ گوارا نہیں کہ ننھی سی بلبلوں کے پیچھے صیاد لگا رہے۔ وہ یہاں کے ہر شخص کو فرہاد کی طرح محنتی دیکھنے کا خواہاں ہے۔ وہ اپنی منزل کا تعین کرے۔ شاعر کشمیر کے عوام کی جہالت دور کرنے اور انہیں حصولِ علم کی طلب و جستجو کرنے اور آدمی سے انسان بننے کی تلقین کرتا ہے۔ ہنر کے ساتھ ساتھ وہ علم و آگہی کو ناگزیر قرار دیتا ہے، اُسے کسی بھی طرح سے یہ گوارا نہیں کہ کشمیری کی زندگی بس یونہی وقت گزارنے میں تمام ہو۔ شاعر پُر خطر اور دشوار گزار راستے میں، خواہ ہمیں کیسی ہی پُر خطر قوتوں سے سابقہ پڑے، ہمتِ مرداں مددِ خدا کا قائل ہے۔ اُن کے نزدیک ہمت اور استقلال کی بدولت پتھروں میں شگاف کر کے راستے کو ہموار کیا جا سکتا ہے۔ شاعر اہلِ کشمیر کے دلوں سے خوف و ہراس کو رفع کرنے کے لئے شیروں کی گرج سے اپنے دلوں کو بیباک کرنے کی تلقین کر رہا ہے۔ نظم میں کشمیری عوام کو سعی پیہم کی تلقین کرتے ہوئے یقین دلایا گیا ہے کہ ہمت اور حوصلے کی بدولت کامیابی کی منزل سے ہمکنار ہونا یقینی ہے۔

فاضل صاحب کی اس نظم کا مطالعہ کرنے کے بعد اقبال کی مشہور فارسی نظم "ساقی نامہ" (پیام مشرق) کی طرف ہماری توجہ مبذول ہوتی ہے جو اُنہوں نے کشمیر کے تاریخی مغل باغ، نشاط میں بیٹھ کر لکھی تھی۔ نظم میں بہار کی منظر کشی کے بعد شاعر اپنے ساقی (خدا) سے دست بدعا ہے کہ اہلِ کشمیر کے دلوں میں آزادی کا جذبہ پیدا کر دے تا کہ وہ بھی عزت و آبرو کی زندگی بسر کر سکیں۔ نظم کے آخری حصے میں اہلِ کشمیر کی غلامی کے نتیجے میں اپنے دین سے بیگانگی، خودی سے ناآشنائی، کمال صناعی کے باوجود بدن پر جامۂ تاتارے، آنکھ عطا ہونے کے باوجود فروغِ نگاہ سے محرومی اور سینے میں دل بیقرار نہ ہونے کا احساس دلایا گیا ہے۔

فاضل صاحب نے اقبال کے بعض اشعار کو کشمیری روپ دینے کی کوشش کی ہے۔

مثال کے طور پر اُن کا یہ مشہور شعر دیکھئے ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے   بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

فاضل صاحب نے اس شعر کا منظوم ترجمہ اس طرح کیا ہے ؎

حسنِ اُچھ گاشہ روس بے چارہ ہاران اوش چھ یمبرزل   سیتھاہ یژ کاٹی باغس منزل گرھان اکھ دیدہ ور پیدا[1]

اُنہیں اقبال کے اُردو کلام کے ساتھ ساتھ اُن کے فارسی اشعار بھی پسند ہیں چنانچہ اپنے مجموعۂ غزلیات ''ساغرِ مستی'' (۱۹۵۸ء) کے سرورق پر اقبال کے ایک مجموعۂ کلام میں درج یہ شعر فاتحۃ الکتاب کے طور پر درج کیا ہے ؎

بگیر ایں ہمہ سرمایۂ بہار از من   کہ گل بدستِ تو از شاخِ تازہ تر ماند

اقبال اور فاضل صاحب دونوں کے نظریۂ شعر میں بڑی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ دونوں شاعری کو جزو یست از پیغمبری مانتے ہیں۔ لیکن فاضل صاحب اس پیغمبری میں ابہام کے بالکل قائل نہیں بلکہ شاعر کی شیریں کلامی اور معناں میں روانی (کوثری) کے حامی ہیں۔ وہ شعر کی تہہ داری اور گہرائی کے قائل ضرور ہیں لیکن اُس ابہام کو ہرگز مستحسن قرار نہیں دیتے جو قاری کے ذہن میں اور اُس کی آنکھوں کے سامنے دھند لکے اور کہرہ کے سوا اور کچھ نہ پیش کر سکے۔ اقبال اور فاضل صاحب دونوں شعر کو انسان کی اخلاقی تربیت کا ایک مؤثر وسیلہ قرار دیتے ہیں۔ دونوں پابند یا منظّم شاعری کے پاسدار ہیں۔ دونوں ردیف و قافیہ کو شعر کے حسن میں اضافہ کرنے کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ انگریزی کے بلینک ورس کی تقلید میں بلا ردیف و قافیہ کہی جانے والی نظموں کی روش دونوں کے نزدیک آئندہ مقبول نہ ہوگی۔

۱۔ نرگس (حسن) بینائی سے محروم ہے اور بے بسی کے عالم میں خون کے آنسو رو رہی ہے۔ ایک بڑی مدت کے بعد گلستان میں ایسا دیدہ ور پیدا ہوتا ہے جو نرگس کے حسن کا قدردان ہو۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی بحیثیت شارح اقبال

اُردو اور فارسی ادب میں علامہ اقبال ایک ایسے نابغہ گزرے ہیں جنہیں نہ صرف اپنی حیات میں عوام وخواص میں مقبولیت حاصل ہوئی بلکہ اُن کے انتقال کے بعد اس مقبولیت میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا۔ ان کی حیات، شخصیت اور کارناموں پر مختلف زبانوں میں اس قدر وافر تعداد میں کتابیں لکھی گئیں کہ ادب میں ایک اہم اور مستقل موضوع ''اقبالیات'' کا اضافہ ہو چکا ہے۔ اقبال کو مقبول عام بنانے میں جہاں اُن کا اپنا خون جگر شامل رہا ہے وہاں اُن ماہرین اقبالیات نے بھی اس میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے جنہوں نے اقبال کے افکار وخیالات کو عام فہم بنا کر اقبال کو سمجھنے کے لئے راہ ہموار کی چنانچہ ان شرحوں کو اقبالیات کے موضوع کے ایک اہم حصے سے تعبیر کیا جائے تو غالباً غلط نہ ہوگا۔ شارحین اقبال نے اپنی اپنی استعداد اور انداز نظر کے مطابق اقبال کے کلام کی شرحیں لکھی ہیں۔ ان شارحین کے اسمائے گرامی اس طرح سے ہیں۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی، مولانا غلام رسول مہر، ڈاکٹر محمد باقر، سید عبدالرشید فاضل، آقائے رازی، محمد عبدالحکیم خان نشتر جالندھری، عارف بٹالوی، صبغتہ اللہ بختیار اور آقا بیدار بخت، بعض شارحین نے اقبال کے کلام کی شرحیں لکھنے کے علاوہ اقبال پر مبسوط کتابیں اور مضامین لکھے ہیں۔ مولانا غلام رسول مہر کے علامہ اقبال سے قریبی روابط تھے۔ اقبال جب گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے گئے تو مہر صاحب اُن کے ہمراہ تھے۔ لندن میں اقبال کی مصروفیت کا حال انہوں نے روزنامہ ''انقلاب'' کو بھیجا جسے ''گفتارِ اقبال'' میں شامل کیا گیا ہے۔ مہر صاحب کے نام اقبال کے کئی خطوط ملتے ہیں جو ''کلیات مکاتیب اقبال'' مرتبہ سید مظفر حسین برنی میں مندرج ہیں۔ ان خطوط کے

مطالعے سے یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ اقبال کو جب کبھی کسی کتاب یا رسالے کی ضرورت محسوس ہوتی تو وہ بے تکلف مہر صاحب کو لکھتے۔ مولانا مہر کا شمار اقبال شناسوں اور اُن کے قریبی ارادت مندوں میں کیا جاتا ہے۔ مہر صاحب نے اقبال کے کلام کی شرح لکھنے کے علاوہ ''دیوان غالب'' کی بھی شرح ''نوائے سروش'' کے نام سے لکھی ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر محمد باقر نے ''احوال و آثار اقبال کے چند پہلو'' کے عنوان سے اقبال پر ایک مبسوط کتاب تحریر کی ہے۔ ''اقبال اور معاشرہ'' کے عنوان سے بھی موصوف کا ایک مضمون ''ماہِ نو'' کے ۱۹۵۶ء کے اپریل کے شمارے میں درج ہے۔ سید عبدالرشید فاضل کا نام مترجمین اقبال کے علاوہ شارحین اقبال کے زمرے میں بھی آتا ہے۔ انہوں نے ''سلسلۂ درسیاتِ اقبال'' کے زیرِ عنوان اقبال پر ایک کتاب لکھی ہے۔ اسرار و رموز کا منظوم اردو ترجمہ فاضل صاحب اور کوکب شادانی کی متفقہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ''اقبال اور عشق رسالتمآبؐ'' بھی فاضل صاحب کی تصنیف ہے''۔ اقبال ایک ریفارمر کی حیثیت میں'' کے عنوان سے فاضل صاحب کا ایک مضمون ''اقبالیات کے نقوش'' (مرتبہ ڈاکٹر سلیم اختر) میں شامل ہے۔ ڈاکٹر محمد باقر، آقائے رازی، نشتر جالندھری، عارف بٹالوی، صبغۃ اللہ بختیار اور آقا بیدار بخت کے اسمائے گرامی بھی شارحین اقبال کے زمرے میں آتے ہیں۔ زیرِ نظر مقالے میں صرف پروفیسر یوسف سلیم چشتی کی شرحوں پر توجہ مرکوز کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اقبال کسی شعر سے مختلف قلوب پر مختلف اثرات کے پیدا ہونے کو اس شعر کی قوت اور زندگی سے تعبیر کرتے ہیں جیسا کہ مولوی صالح محمد کو اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> ''ایک ہی شعر کا اثر مختلف قلوب پر مختلف ہوتا ہے، اس اختلاف کی وجہ قلوبِ انسانی کی اصلی فطرت اور انسانی تعلیم و تربیت اور تجربہ کا اختلاف ہے۔ اگر کسی شعر سے مختلف اثرات مختلف قلوب پر ہوں تو یہ بات اس شعر کی قوت اور زندگی کی دلیل ہے۔ زندگی کی اصل حقیقت تنوع اور گونا گونی ہے''[1]۔

---

[1] شیخ عطاء اللہ، اقبال نامہ، حصہ دوم، ص ۳۷۱۔۳۷۲۔

پروفیسر چشتی صاحب کو مستثنیٰ کر کے دیگر تمام شارحین اقبال نے اقبال کے شعری مجموعوں کی جستہ جستہ شرح لکھی ہے[1]۔ تاہم کلام اقبال کی لکھی گئی شرحوں کے متعلق عام تاثر یہی رہا ہے کہ شرح کا کما حقہ حق ادا نہیں ہو پایا ہے۔ پروفیسر چشتی صاحب کو اس ضمن میں ایک استثنیٰ کی حیثیت حاصل ہے بلکہ حق تو یہ ہے کہ بعض اوقات اُن کی شرحوں کے متعلق بھی بے اطمینانی کا اظہار کیا جاتا ہے تاہم پروفیسر چشتی صاحب کو اقبال کا ایک باقاعدہ، سنجیدہ اور مکمل شارح ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ انہوں نے اقبال کے تمام شعری مجموعوں بانگِ درا، بال جبریل، ضرب کلیم، پیام مشرق، ارمغان حجاز، جاوید نامہ، اسرار خودی، رموزِ بے خودی، زبورِ عجم، پس چہ باید کرد اے اقوام شرق کی شروح لکھنے کے علاوہ ماہِ نو، اقبال ریویو، نیرنگ خیال (لاہور) اور دوسرے کئی رسائل میں اقبال پر مختلف عنوانات کے تحت مضامین لکھے ہیں۔ ان مضامین کے عنوانات اس طرح سے ہیں:

۱۔ تعلیمات اقبال (تصور زمان و مکاں)

۲۔ تعلیمات اقبال و پیام حریت یا ترجمان حقیقتؔ اقبال کی تعلیمات کا نچوڑ

۳۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن اور علامہ اقبال مرحوم کے بعض فلسفیانہ اور مذہبی افکار میں مماثلت

۴۔ تصور فقر (بسلسلۂ اقبالیات)

۵۔ ملفوظاتِ اقبال (یہ پروفیسر چشتی صاحب کی ڈائری کے چند اوراق ہیں جو علامہ اقبال کی یادوں پر مشتمل ہیں)

۶۔ علامہ اقبال اور سلطان ٹیپو شہید

۷۔ خدا اور خودی

۱۔ عارف بٹالوی نے ضرب کلیم کی شرح لکھی ہے، مہر صاحب نے بانگِ درا اور بالِ جبریل کی شرح لکھی ہے، صبغۃ اللہ بختیار نے جاوید نامہ، ڈاکٹر محمد باقر نے بانگِ درا، آقا بیدار بخت نے ارمغان حجاز کی شرح لکھی ہے، بال جبریل کی شرح پروفیسر چشتی صاحب کے علاوہ فاضل صاحب، آقائے رازی، ڈاکٹر محمد باقر، مہر صاحب اور نشتر جالندھری نے لکھی ہے۔

۸۔ انوار مجددی

۹۔ اقبال اور مولانا سید احمد مدنی

۱۰۔ اقبال اور فلسفۂ مغرب

پروفیسر چشتی صاحب نے تصوف پر بھی کام کیا ہے۔ ''اسلامی تصوف'' میں غیر اسلامی عناصر'' اُن کی ایک تالیف ہے، یہاں پروفیسر موصوف کے اقبال پر لکھے گئے مضامین اور دیگر موضوعات پر ان کی تحریر کی گئی تصانیف سے بحث کرنا مقصود نہیں بلکہ فقط اُن کی اقبالی شرحوں کا تجزیہ کرنا مطلوب ہے۔ ان شرحوں کا تجزیہ کرتے وقت سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگرچہ اردو زبان و ادب نے لاتعداد شعراء پیدا کئے تو صرف مرزا غالب اور علامہ اقبال کے کلام ہی کی شرحیں لکھنے کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ دونوں ایسی نابغہ روزگار شخصیتیں گزری ہیں جن کے افکار و خیالات میں وسعت تنوع اور گہرائی ملتی ہے، اور جیسے جیسے تحقیق و مطالعے کی حدود وسعت اختیار کرتی جاتی ہیں اُن کے کلام کے معانی کی نئی نئی جہتیں سامنے آتی رہتی ہیں۔ جہاں تک اقبال کا تعلق ہے انہوں نے شعر کے صدف دل سے گہر کی صورت میں نکلنے کے معیار کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ تخلیق شعر کے وقت اُن پر ایک روحانی اور لطیف کرب کی کیفیت طاری ہو جایا کرتی تھی۔ رمز و ایما کو اُن کے یہاں بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ ظاہر ہے جو شاعر تخلیق شعر کے دوران جگر کاوی اور جانکاہی سے کام لے اور شاعر کو وارثِ پیغمبری قرار دے بھلا اس کے خلاق ذہن سے نکلا ہوا شعر اس گہر آبدار کی مانند کیوں نہ ہو جسے تراشنے میں فن کار کا خون جگر شامل رہا ہو۔ ظاہر ہے اقبال جیسے عظیم فن کار کی شاعری کو سمجھنے اور اسے ذہن نشین کرانے کے لئے ایک ایسے قابل اور کار آزمودہ شارح کی ضرورت تھی جو صحیح معنوں میں شارح اقبال کہلانے کا مستحق ہو۔ پروفیسر چشتی صاحب اقبال کے ایک سنجیدہ طالب علم رہے ہیں۔ انہوں نے اقبال کے کلام کا نہایت غائر مطالعہ کیا ہے اور اسی مطالعے کی بدولت انہیں اقبال کی شخصیت سے گہرا لگاؤ پیدا ہوا۔ کلام اقبال کے مطالعے کے دوران انہیں جب کبھی کسی استفسار کی ضرورت پڑتی یا

اقبال کی رہنمائی مطلوب ہوتی تو وہ اقبال سے رجوع کرتے اور اُن سے مختلف مسائل اور موضوعات پر گفتگو ہوتی۔ چنانچہ کلام اقبال کو قابل فہم بنانے میں جہاں پروفیسر چشتی صاحب نے اپنی بے پناہ صلاحیتوں کو بروئے کار لایا ہے وہاں اقبال کی صحبتوں اور ان سے استفادے نے بھی ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ پروفیسر چشتی صاحب کی علامہ سے ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۸ء تک وقتاً فوقتاً حسب ضرورت ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ان ملاقاتوں کے دوران پروفیسر چشتی صاحب اقبال سے متعدد مسائل اور موضوعات پر گفتگو کر کے ارشاداتِ اقبال کو ایک نوٹ بک میں محفوظ کرتے رہے۔ اقبال سے پروفیسر موصوف کو ملاقاتوں کے زیادہ مواقع اُس زمانے میں میسر ہوئے جب اقبال انجمن حمایت اسلام کے صدر تھے۔ یہ زمانہ ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء کا ہے۔ پروفیسر چشتی صاحب اس زمانے میں انجمن کے قائم کردہ اشاعت اسلام کالج کے پرنسپل تھے۔ اقبال کو اس کالج سے بڑی دلچسپی تھی۔ یہ کالج ۱۹۲۹ء میں اقبال اور میر غلام بھیک نیرنگ کی متفقہ کوششوں سے قائم ہوا تھا۔

شارح کے لئے یہ لازم ہے کہ وہ شعر کی تشریح اس طرح کرے کہ قاری اُس شعر کا مفہوم بخوبی سمجھ لے۔ شعر و شاعری سے شغف رکھنے والے شرح کا مطالعہ اس مقصد کے تحت کرتے ہیں کہ وہ بغیر کسی استاد کی اعانت اور رہنمائی کے شعر کے مفہوم کو ذہن نشین کر سکیں چنانچہ شرح جیسے مشکل اور محنت طلب کام سے عہدہ برآ ہونے کے لئے شارح پر ایک بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، پروفیسر چشتی صاحب نے اس ذمہ داری کو خوش اسلوبی کے ساتھ نبھانے کی بڑی حد تک کوشش کی ہے۔ ان کی شرحوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شعر فہمی کی صلاحیتوں سے بہرہ مند ہیں۔ اردو کے علاوہ انہیں فارسی پر بھی دسترس حاصل ہے۔ اقبال کے اشعار کو قابل فہم بنانے کے لئے فارسی اشعار کا حوالہ دیکر قاری کے ذہن پر اُن کا گہرا نقش ثبت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اقبال کی شاعری میں تلمیحات، بالخصوص قرآنی تلمیحات، احادیث نبوی، مذہبیات اور تصوف کے علاوہ اقبال کے ماخذات جیسے مثنوی مولانا روم، قرآن حکیم اور فارسی شاعری کے اکابرین رومی، حافظ،

سعدیؔ بیدلؔ، خاقانی وغیرہ پر پروفیسر چشتی صاحب کی گہری نظر ہے۔ پروفیسر موصوف فارسی شاعری کے ان اکابرین کے برجستہ حوالوں سے اقبال کے اشعار کو قابل فہم بنانے کا غیر معمولی ملکہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے رفیق خاور کے الفاظ میں ''اسلامی افکار و نظریات کے اصلی ذرائع سے استفادہ کر کے وحدت الوجود کے بارے میں نہایت اہم انکشافات کئے ہیں۔''

اقبال نے اُردو شاعری کو موضوع کے اعتبار سے ہی متغیر نہیں کیا بلکہ زبان و بیان میں بھی انقلابی تبدیلیاں پیدا کیں اور پہلی مرتبہ اُردو شاعری کو روایتی غزلیہ زبان کے اثرات سے آزاد کر کے نظمیاتی زبان سے آشنا کیا۔ پروفیسر چشتی صاحب نے اقبال کے مخصوص لسانی برتاؤ کا کماحقہ جائزہ لیا ہے اور زبان کے مضمرات کو بروئے کار لایا ہے۔ ایک شارح کی کامیابی اس بات میں پوشیدہ ہے کہ وہ شاعر کے لسانی برتاؤ پر نظر رکھے اور لفظوں اور پیکروں کی معنوی نزاکتوں، خاندانی رشتوں، تاریخی اور ثقافتی معنویتوں کا علم و ادراک رکھے جب ہی وہ نظم یا غزل کی روح تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ پروفیسر چشتی صاحب زبان شناس ہیں۔ وہ شعری زبان کی خصوصیات سے گہرے طور پر واقف ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ شعری زبان روزمرہ کی زبان یا نثر کی ترسیلی زبان سے مختلف ہوتی ہے۔ روزمرہ کی گفتگو میں ہم اپنے مافی الضمیر کو دوسروں تک منتقل کرنے کی سعی کرتے ہیں اور اس کے لئے وہی الفاظ استعمال کرتے ہیں جو ترسیلیت کا حق ادا کریں۔ یہی صورت حال مختلف علوم مثلاً سائنس، اقتصادیات، سیاسیات اور تاریخ وغیرہ میں بھی ملتی ہیں۔ ان علوم کی ترسیل بھی پوری قطعیت کے ساتھ انجام دی جاتی ہے۔ ان کے برعکس شاعری میں جو زبان برتی جاتی ہے وہ خیال یا مفہوم یا موضوع کی راست ترسیلیت کے بجائے شاعر کے داخلی تجربے کی بازیافت کرتی ہے۔ اس لئے زبان ایک مخصوص طریقے سے برتی جاتی ہے۔ چنانچہ تشبیہ، استعارہ، پیکر اور علامت کا سہارا لیا جاتا ہے۔ یہ شعری زبان کے عناصر ہیں اور ان کے ادغام سے شعری تجربہ معرضِ وجود میں آتا ہے۔ چشتی صاحب زبان کے ان عناصر کی کارکردگی کا پورا علم رکھتے ہیں۔ انہوں نے اقبال کی شاعری میں ان عناصر بالخصوص تشبیہ،

استعارہ، اور علامت کے برتاؤ کا وقتِ نظر کے ساتھ جائزہ لیا ہے اور معنی کی نازک سے نازک کیفیت کو بھی اجاگر کیا ہے۔ پروفیسر چشتی صاحب نے ہر مجموعے کی شرح لکھتے وقت یہ التزام کیا ہے کہ کسی نظم یا غزل کی شرح سے پہلے اس کے بنیادی تصور یا مرکزی خیال پر روشنی ڈالی گئی ہے اور حسب ضرورت تمہید کہیں اختصار اور کہیں طوالت کے ساتھ بیان کرکے اس نظم یا غزل کی تشریح اس طرح کی ہے کہ قاری شارح کی سخن فہمی اور اظہار بیان پر مہارت کی داد دئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پروفیسر صاحب نے اقبال کے کلام کا مطالعہ قرآن و حدیث کی روشنی میں بھی کیا ہے۔ اشعار جن کے مفاہیم قرآن اور حدیث سے ماخوذ ہیں، کے حوالے دیکر ان آیات کا ساتھ ساتھ ترجمہ بھی درج کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں ''پیام مشرق'' کی ایک مختصر نظم ''غلامی'' بطور نمونہ ملاحظہ کیجئے۔

آدم از بے بصری بندگیٔ آدم کرد　　گوہرے داشت ولے نذر قباد و جم کرد
یعنی از خوئے غلامی زسگان خوارتر است　　من ندیدیم کہ سگے پیش سگے سرخم کرد

پروفیسر صاحب مذکورہ نظم کی تمہید اور مفہوم بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ یہ نکتہ قرآن کریم کی آیت ''اولئك كالانعام بل هم اضل'' سے ماخوذ ہے۔ یعنی جو لوگ نہ حق کو سنتے ہیں نہ سمجھتے ہیں (اور اس لئے انسانوں کی غلامی کرتے ہیں) وہ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ اُن سے بھی زیادہ گمراہ (خوارتر) ہیں۔

مشاہیر پر جن میں مختلف زبانوں کے شاعر، ادیب، دانشور، مورخ اور بادشاہ شامل ہیں، اقبال نے کئی نظمیں لکھی ہیں۔ ان کی شرح لکھنے سے پیشتر ان مشاہیر کے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ مثلاً غنی کاشمیری، مصطفےٰ کمال پاشا، شوپن ہاور، ٹالسٹائی، کارل مارکس، ہیگل، آین اسٹائن، بائرن، نٹشے، پٹوفی (ہنگری کا ایک جوان مرگ محبّ وطن شاعر) گوئٹے وغیرہ غیرہ۔ جاوید نامہ، جو اقبال نے اطالیہ کے معروف شاعر دانتے کی ''ڈیوائن کامیڈی'' کے پیٹرن پر لکھا ہے اس میں مولانا روم کی رہنمائی میں افلاک کی سیر کے دوران کئی اشخاص کی روحوں سے ملاقات کی گئی ہے۔ پروفیسر صاحب کتاب کے فصل دوم میں

جاوید نامہ کا تعارف کراتے ہوئے ''ڈیوائن کامیڈی'' کے متعلق لکھتے ہیں۔ ''ڈیوائن کامیڈی کا یہ نام دانتے کا تجویز کردہ نہیں ہے۔ اس نے اپنے آسمانی ڈرامے کا نام فقط کامیڈیا رکھا تھا۔ لفظ ڈیوائن کا اضافہ اس کے مداحوں اور قدر دانوں نے کیا۔ اس کتاب کے جس سب سے پہلے ایڈیشن کا نام ''ڈیوائن کامیڈی'' رکھا گیا وہ ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا تھا۔

پروفیسر صاحب نے دانتے کے سوانح ڈیوائن کامیڈی کا اجمالی تعارف اور پھر ان دونوں تصانیف کا موازنہ بڑی فنکاری کے ساتھ کیا ہے، جاوید نامہ کا فصل دہم ''فلک زحل میر جعفر اور میر صادق جیسی ارواحِ رزیلہ کا مسکن ہے، ان غداروں کو دوزخ نے بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مذکورہ فضل میں قلزم خونین میں ایک زورق میں یہ دو غدار سوار دکھائے گئے ہیں۔ ان کی حالت کا کچھ اندازہ ؎ زرد رُو عریاں بدن آشفتہ موئے

والے مصرعے سے ہو سکتا ہے۔ ان میں سے ایک غدار نالاں و گریاں ہو کر کہہ رہا ہے کہ ہم نے مر کر بھی چین نہیں پایا۔ یکا یک قلزم خونین میں ایک ہولناک طوفان اٹھتا ہے جس میں یہ کشتی غائب ہو جاتی ہے۔ قلزم خونین والا یہ حصہ ملاحظہ کیجئے ؎

آنچہ دیدم می نگنجد دربیاں — تن زہمش بے خبر گردد زجان
من چہ دیدم قلزمے دیدم زخون — قلزم طوفان بروں، طوفان درون
در ہوا ماران چو در قلزم نہنگ — کفچہ شب گون بال و پر سیماب رنگ
موجہا درندہ مانند پلنگ — از نہیبش مردہ بر ساحل نہنگ
بحرِ ساحل را امان یک دم نداد — ہر زمان کہ پارۂ در خون فتاد
موجِ خون باموج خون اندر ستیز — درمیانش زورقے در اُفت و خیز
اندرآن زورق، دو مرد زرد روئے — زرد رُو عریاں بدن آشفتہ موئے

پروفیسر صاحب اس حصے کی شرح ان الفاظ میں لکھتے ہیں: ''جب ذرا آگے بڑھے تو زندہ رود نے ایک خون کا دریا دیکھا۔ نہایت وحشت خیز اور ہولناک۔ ہر طرف ہوا میں سانپ لہرا رہے تھے اور ہر لحظہ کہ پارے دریائے خون میں گر رہے تھے۔ موجیں آپس میں

برسر پیکار تھیں۔ ان موجوں میں ایک کشتی اُفت وخیز میں مبتلا تھی۔ اس کشتی میں دو شخص بیٹھے ہوئے تھے، جعفر اور صادق، ان کی حالت یہ تھی کہ چہرہ زرد تھا، جسم عریاں اور بال پریشاں، یعنی اُن کی صورت ہی سے زشتی کردار عیاں تھی''[1]۔

اب ''پیام مشرق'' سے جو اقبال نے جرمنی کے معروف حکیم گوئٹے کے مغربی دیوان کے جواب میں لکھی ہے چند نمونے پیش ہیں۔ اس مجموعے کے تیسرے حصے ''مئے باقی'' کی یہ غزل ؎

ہوس منزل لیلےٰ نہ تو داری و نہ من جگر گرمی صحرا نہ تو داری و نہ من

ملاحظہ کیجئے۔ اس غزل کی تمہید میں پروفیسر صاحب رقمطراز ہیں۔ ''یہ نظم (غزل) اقبال نے اپنے کسی صوفی دوست کو لکھ کر بھیجی تھی جس کا نام انہوں نے مصلحتاً ظاہر نہیں کیا۔ بنیادی تصور جو اس نظم (غزل) کے تمام اشعار میں مشترک ہے یہ ہے کہ اسلام کی محبت نہ تیرے دل میں ہے نہ میرے اور تیرے اور میرے سے پوری قوم مراد ہے۔ پھر شعر کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے ''یوں تو ہم دونوں (ہم سب) الفتِ لیلیٰ کے مدعی ہیں۔ (لیلیٰ کنایہ ہے اسلام سے) لیکن اس کے حصول کے لئے صحرا نوردی کا حوصلہ (جگر) نہ تجھ میں ہے نہ مجھ میں۔ یعنی زبان سے ہم سب اسلام کی محبت کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن اس کو سربلند کرنے کے لئے تکلیف برداشت نہیں کر سکتے۔

دوسرا شعر ؎

من جوان ساقی و تو پیر کہن میکدۂ بزم ما تشنہ صہبا نہ تو داری و نہ من

میں بظاہر بڑا مستعد کارکن (جوان ساقی) ہوں اور تو ایک پرانے میکدہ (قدیمی خانقاہ) کا سجادہ نشین ہے۔ قوم (بزم) تشنۂ ہدایت ہے لیکن شراب (ہدایت) نہ تیرے پاس ہے نہ میرے، یعنی نہ میں ہدایت کا فرض انجام دے سکتا ہوں نہ تو۔

تیسرا شعر ؎

۱۔ شرح جاوید نامہ۔ ص ۲۰۰

دل ودین در گروِ زہرہ شانِ عجمی آتشِ شوقِ سلیمیٰ نہ تو داری و نہ من

یعنی ہم دونوں غیر اسلامی تصورات وعقاید (زہرہ شانِ عجمی) کے پیرو ہیں۔ اسلام (سلیمیٰ) کی محبت نہ تیرے دل میں ہے نہ میرے۔

چوتھا شعر ؎

خزفے بود کہ از ساحلِ دریا چیدیم دانۂ گوہر یکتانہ تو داری و نہ من

ہم دونوں نے ساحل دریا سے (دین اسلام) کچھ خزف ریزے یعنی ٹھیکریاں (ظاہری رسوم) جمع کرلی ہیں۔ گوہر یکتا (اسلام کی روح یعنی جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ) نہ تیرے دل میں ہے نہ میرے۔

پانچواں شعر ؎

دگر از یوسفِ گم گشتہ سخن نتواں گفت تپشِ خونِ زلیخا نہ تو داری ونہ من

ہم کو یوسفِ گم گشتہ (اسلام کی عظمتِ رفتہ) کا ذکر کرنا یعنی اسلام کو سربلند کرنے کا دعویٰ کرنا زیب نہیں دیتا کیونکہ اسلام کی محبت (تپشِ خونِ زلیخا) نہ تیرے دل میں ہے نہ میرے۔

آخری شعر ؎

بہ کہ بانورِ چراغ تہِ دامان سازیم طاقتِ جلوۂ سینا نہ تو داری ونہ من

بہتر یہی ہے کہ ہم اُن تمناؤں کے حصول کی کوشش کریں جو ہمارے دل میں پوشیدہ ہیں کیوں کہ خدا کے دیدار (جلوۂ سینا) کی طاقت نہ تجھ میں ہے نہ مجھ میں۔ اس آخری شعر میں بڑا زبردست طنز مخفی ہے جس کا اظہار لفظوں کے ذریعے سے نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح ''مے باقی'' کی دوسری غزلوں مثلاً ؎

مرا زدیدۂ بینا شکایت دگر است ؎

از ما بگو سلامے آن ترک تند خورا ؎

زخاکِ خویش طلب آتشے کہ پیدا نیست ؎

بُتاں تازہ تراشیدۂ دریغ از تو ؎

شعلہ در آغوش دارد، عشق بے پروائے من

جہانِ عشق نہ میری نہ سروری داند

گریۂ ما بے اثر، نالۂ ما نارسا لست

کی شرحوں کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ پروفیسر صاحب نے اقبال کے کلام کی شرحوں کا حق کس حد تک ادا کیا ہے۔ "پیام مشرق" کی نظموں کے حصے کو دیکھئے۔ اس حصے کی ایک نظم بعنوان "اگر خواہی حیات اندر خطر زی" کی شرح لکھتے ہوئے پروفیسر صاحب تمہید میں لکھتے ہیں: "اس مختصر تمثیلی نظم میں اقبال نے اپنا فلسفہ واضح کیا ہے کہ مشکلات اور خطرات کا مقابلہ کرنے سے ہی انسان کی خودی مستحکم ہوسکتی ہے۔ جو شخص آرام کی زندگی بسر کرتا ہے وہ کبھی کسی مہم کو سر نہیں کرسکتا اور نہ میدان جنگ میں کامیابی حاصل کرسکتا ہے۔ اقوام عالم کی تاریخ اقبال کے فلسفے کی تائید کرتی ہے۔ یعنی جب کسی قوم میں تن پروری اور راحت طلبی پیدا ہوگئی تو وہ قوم مغلوب ہوکر رفتہ رفتہ دنیا سے مٹ گئی"۔ اس مجموعے سے "لالۂ طور" والے حصے کی یہ رُباعی ملاحظہ کیجئے

به یزدان روز محشر برہمن گفت   فروغِ زندگی تابِ شرر بود

و لیکن گر نرنجی باتو گویم   صنم از آدمی پائندہ تر بود

رباعی کے بنیادی تصور کے متعلق پروفیسر صاحب لکھتے ہیں "اس رباعی میں انسان کی ناپائیداری بیان کی گئی ہے"۔ پھر رباعی کا مفہوم ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ "قیامت کے روز برہمن نے خدا سے کہا کہ انسان کا عرصۂ زندگی بہت مختصر تھا۔ تاب شرر کنایہ ہے اقل قلیل مدت سے۔ لیکن اے خدا! اگر تو ناراض نہ ہو تو میں یہ عرض کروں کہ میری مخلوق تیری مخلوق سے زیادہ پائیدار تھی"۔ پھر لکھتے ہیں "اقبال نے یہ دل کش اسلوب اس لئے اختیار کیا ہے کہ پڑھنے والوں کے دل پر انسان کی ناپائیداری کا نقش قائم ہو"۔ "پیام مشرق" کی ان نظموں کی شرح کا مطالعہ کیجئے جن کے عنوانات اس طرح ہیں، بوئے گل، نوائے وقت، تسخیر فطرت، سرودِ انجم، پند باز با بچۂ خویش، کبر وناز، حدی (نغمۂ ساربان حجاز)

تنہائی کشمیر وغیرہ وغیرہ تو شاید ہی کوئی ان کے متعلق بے اطمینانی کا اظہار کرے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ شعر کی تشریح کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف تو کیا جاتا ہے لیکن قاری کے پلے کچھ نہیں پڑتا بلکہ شعر کو الٹا گورکھ دھندا بنا دیا جاتا ہے۔ اور بات سلجھنے کی بجائے الجھتی ہی چلی جاتی ہے مگر پروفیسر صاحب اس بات کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں کہ شعر قاری کے ذہن نشین ہو صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اُن کی یہ بھی کوشش رہتی ہے کہ قاری کے ذہن پر اس کے گہرے نقوش قائم ہوں۔ اس کے لئے پروفیسر صاحب بعض اوقات بلکہ بسا اوقات تفصیلات میں بھی جانے سے گریز نہیں کرتے۔ کلام اقبال کی شرحوں میں پروفیسر صاحب نے اپنی استعداد اور فہم و فراست کو زیادہ تر بروئے کار لایا ہے اور حسب ضرورت اقبال سے بھی مدد حاصل کی ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی مجموعے کی شرح لکھتے وقت دیگر شارحین کی شروح شارح کے ذہن پر غیر شعوری طور پر اس حد تک اثر انداز ہوتی ہیں کہ اس کی اپنی منفرد آواز دوسری آوازوں کے ساتھ مل کر یا اس میں حلول ہو کر گم ہو جاتی ہے مگر پروفیسر صاحب کی اپنی منفرد آواز ان شرحوں میں بین طور سے سنائی دیتی ہے۔

مشاہدات، مطالعات اور غور و فکر کے نتیجے میں اقبال کی فکر میں بتدریج ارتقاء ہوتا رہا۔ انہوں نے دقیق خیالات کے اظہار کے لئے فارسی زبان کو اپنایا۔ اُردو سے فارسی کی طرف رجوع کرنے کے باعث بھی اقبال کے کلام کو سمجھنے اور ذہن نشین کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ تاہم یہ پروفیسر صاحب کی ذات کا فیض ہے کہ انہوں نے اُردو دان طبقے کے لئے اقبال کے فارسی کلام کو قابلِ فہم بنایا۔ کلام اقبال کے مطالعے کے دوران پروفیسر صاحب کو خود بھی کئی مشکلات سے سابقہ پڑا ہے، جن کی تسہیل کے لئے انہوں نے علامہ اقبال سے رسم و راہ پیدا کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ پروفیسر صاحب اکتوبر ۱۹۲۵ء میں اپنے ایک دوست ملک عبدالمجید کی معیت میں علامہ کی خدمت میں پہلی مرتبہ حاضر ہوئے۔ اس کے بعد پروفیسر موصوف کی علامہ سے وقتاً فوقتاً ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ایک روز پروفیسر صاحب جب اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے تو علامہ سے دبی زبان میں عرض کی کہ اسرارِ خودی اور پیام مشرق میری سمجھ

میں نہیں آرہی ہیں تو علامہ نے ان تصانیف کا بار بار مطالعہ کرنے کی پروفیسر صاحب کو ہدایت کی۔ پروفیسر صاحب نے اقبال کی ہدایت کے مطابق ان کتابوں کا ازسرِ نو مطالعہ کرنا شروع کیا۔ پروفیسر صاحب کے ایک بیان کے مطابق انہوں نے ایک ملاقات میں علامہ سے اسرارِ خودی کے بعض اشعار ان ہی سے سمجھنے کی گزارش کی تھی جس پر اقبال راضی بھی ہوئے تھے چنانچہ ایک روز علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے اس کے بہت سے اشعار ذہن نشین کیے۔ انہوں نے اقبال سے ''گلشن راز جدید'' اور ''اسرار و رموز کے مشکل مقامات حل کرنے کا بھی شرح اسرار خودی کے پیش لفظ میں اعتراف کیا ہے، حالانکہ اقبال شعر کی شرح کے سلسلے میں شاعر سے شعر کا مفہوم جاننے کو بالکل غیر ضروری بلکہ، مُضر سمجھتے ہیں۔ مگر بعض اوقات شاعر سے شعر کا مفہوم سمجھنا اور جاننا ناگزیر بن جاتا ہے۔ پروفیسر صاحب اقبال سے وقتاً فوقتاً مختلف موضوعات اور مسائل مثلاً یاجوج ماجوج، حکیم اسپنوزا، جناب مسیح کی ولادت، مذہب کی غایت، بقائے روح، وحدت الوجود، ختم نبوت، محمد علی باب، مذہب اور نظریۂ حلول (Pantheism) میں بنیادی فرق، ملوکیت، خدا اور انسان کا باہمی رشتہ ایمان اور عقل میں رشتہ وغیرہ وغیرہ پر بحث کرتے اور ان کے متعلق علامہ کی رائے جان لیتے۔ ان تمام موضوعات اور مسائل کا بیان اقبال کی شاعری اور نثری تحریروں میں رہ رہ کر آیا ہے۔ پروفیسر صاحب اقبال کے کلام کی شرحوں کے ذریعے سے بیش بہا معلومات فراہم کرنے کے علاوہ بڑے پتے کی باتیں کہہ دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر اقبال نے اپنے کلام میں بعض الفاظ کا اکثر و بیشتر مقامات پر استعمال کیا ہے۔ ان میں شاہین اور لالہ بھی شامل ہے بلکہ ''لالۂ صحرا'' کے عنوان سے تو اُن کے یہاں ایک پوری نظم بھی ملتی ہے۔ ''پیام مشرق'' جن پانچ حصوں پر مشتمل ہے ان میں سے ایک لالۂ طور بھی ہے۔ پروفیسر صاحب اس عنوان کی شرح اس طرح کرتے ہیں۔ ''اقبال نے رباعیات کے اس مجموعے کو استعارۃً لالۂ طور سے موسوم کیا ہے۔ طور جیسا کہ سب جانتے ہیں وہ مقام ہے جہاں حضرت موسیٰؑ نے حسن مطلق کی تجلی دیکھی تھی۔ لالہ اقبال کے کلام میں ایک

علامت (Symbol) یعنی مظہرِ عشق ہے۔ اسی لئے عالمِ نباتات میں اس کا مرتبہ سب سے بلند ہے جیسا کہ سعدیؔ کے اس مصرعے سے ثابت ہوتا ہے۔ ؎ در باغ لالہ روید در شورہ بوم حسن آگ چونکہ دور سے سرخ دکھائی دیتی ہے اس لئے اسے بھی لالہ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ چراغ کی لو کو بھی جو عموماً صنوبری شکل کی ہوتی ہے لالہ کہتے ہیں۔ اس لئے اقبال نے اس نور کی چمک کو جو حضرت موسیٰؑ نے دیکھی تھی، لالہ سے تشبیہ دی ہے اور چونکہ ان رُباعیات میں اکثر و بیشتر مقامات میں حقیقت وجود سے بحث کی ہے اور ان کا مرکزی تصور سرِ ظہور یا سرِ تخلیق ہے۔ اس لئے ان رباعیات کا عنوان لالہ طور قرار دیا ہے''[1]۔

پروفیسر صاحب کی شرحوں کی خصوصیات سے قطع نظر کر کے ان میں در آئی چند خامیوں کا ذکر کرنا غالباً بے محل نہ ہوگا۔ پروفیسر صاحب بعض اوقات غیر ضروری طور پر ان طول طویل خیالات کا اظہار کرتے ہیں جن کا شعر سے بہت کم اور کبھی کبھار دور کا واسطہ ہوتا ہے۔ ان شرحوں کے متعلق یہ رائے بھی ظاہر کی جاتی ہے کہ پروفیسر صاحب پہلے سے ہی ایک چوکھٹا تیار کر کے رکھ لیتے ہیں جسے بعد میں شعر پر کسی نہ کسی طریقے سے اور بعض اوقات زبردستی کے ساتھ فٹ کر دیا جاتا ہے۔ پروفیسر صاحب بعض اوقات شرح کے دوران روایتی آراء کو دہراتے ہیں۔ مثلاً دیوانِ غالب کی شرح کے دوران پروفیسر صاحب لکھتے ہیں کہ غالب تصوف کے برائے شعر گفتن ہی کی حد تک قائل تھے۔ بقول رفیق خاور

''اگر تعارف میں مکتبی ورمی رنگ غالب نہ ہوتا تو کتاب کی افادی حیثیت زیادہ بلند ہوتی''[2]۔

پروفیسر صاحب کی اقبالی شرحوں کا جہاں تک تعلق ہے وہ آسان سے آسان شعر کی بھی شرح لکھ دیتے ہیں مگر بیچ بیچ میں چار چار پانچ پانچ اشعار کو فقط ایک ایک جملے میں سمیٹنا کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ ''پیامِ مشرق'' کی نظم بعنوان ''کشمیر'' چھ اشعار پر مشتمل ہے، پروفیسر صاحب پہلے چار اشعار کی شرح صرف ایک جملے میں کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں ''ان

۱۔ شرح پیامِ مشرق (پروفیسر یوسف سلیم چشتی)۔ ص ۵۱

۲۔ ماہِ نو۔ جولائی ۱۹۵۹ء ص ۶۰

اشعار میں کشمیر کی وادیوں کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ شعر فہم ان اشعار کو بخوبی سمجھ سکتا ہے لیکن ایک عام قاری کے لئے یہ کچھ زیادتی معلوم ہوتی ہے"۔

کلام اقبال کی شرحوں کے ضمن میں صغیر اصغر جارچوی نے ایک عجیب بات کہی ہے۔ اُن کا بیان ہے کہ اقبال کے کلام کی شرحوں کو پڑھ کر کتنے افراد قوم علامہ موصوف کے تخیلات اور فلسفہ سے آگاہ ہوئے اور کتنے لوگوں میں کلام کے اثر سے خودی پیدا ہوئی۔ اس بیان سے یہ تاثر ملتا ہے کہ اقبال کے کلام کی لکھی گئی شرحوں میں دم ہوتا تو افراد قوم اقبال کے تخیلات اور فلسفہ سے آگاہ ہوتے یا ان میں خودی پیدا ہوئی ہوتی۔ اس بارے میں عرض یہ ہے کہ اقبال کے تخیلات اور فلسفہ سے آگاہ نہ ہونے یا افراد میں خودی پیدا نہ ہونے کے لئے ان کے کلام کی لکھی گئی شرحیں ہرگز ذمہ دار نہیں ہیں، اگر یہ بات ہوتی تو قرآن پاک کے مستند تراجم اور تفاسیر پڑھنے اور انہیں سمجھنے والے سب کے سب نیک بزرگ اور عمل صالح کرنے والے ہوتے، تاہم ان تمام فروعی باتوں اور اعتراضات کے باوجود پروفیسر صاحب کی شرحوں کی افادی حیثیت اور اہمیت سے ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال کے پورے کلام کی شرح کے سلسلے میں پروفیسر صاحب کے پائے استقامت کہیں نہیں ڈگمگائے۔ کلامِ اقبال کی شرحیں لکھنے کا بیڑا اٹھانا اور اسے پایہ تکمیل تک پہنچانا اس بات کی ضمانت ہے کہ یہ شرحیں ضرور لائق اعتنا سمجھی گئی ہیں ورنہ پروفیسر صاحب ایک یا دو مجموعوں کی شرح لکھ کر بے اطمینانی کا شکار ہو کر اس کام سے دستبردار ہوتے۔ یہ ضرور ہے کہ اتنے بڑے کام میں خامیوں یا کوتاہیوں کا راہ پا جانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ پھر اس وسیع و عریض کائنات کی وہ کون سی چیز ہے جو خامیوں سے یکسر پاک ہو۔ اس سلسلے میں "جاوید نامہ" کی شرح کے دیباچے میں پروفیسر صاحب کی کوتاہیوں کے اعتراف کو ہرگز نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ موصوف لکھتے ہیں:

> "میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ اس کتاب کی شرح کا کما حقہ حق ادا نہیں کر سکا تاہم اس خیال سے کہ شاید میری کوششِ ناتمام سے شایقین

کو اس عظیم الشان کتاب کے سمجھنے میں کچھ آسانی ہو جائے، میں یہ کتاب
شائع کرنے کی جرأت کر رہا ہوں"[1]۔

اقبال نے اپنی کئی نظموں پر شذرے تحریر کئے ہیں جو انہیں سمجھنے اور ان کا تجزیہ کرنے میں بڑی حد تک ہماری اعانت کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اپنے بعض اشعار کا مفہوم بھی خود ہی بیان کیا ہے جیسے یہ شعر ؎

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں　　موج ہے دریا میں بیرونِ دریا کچھ نہیں

اقبال اس شعر کا مفہوم لکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ مذکورہ شعر میں جس نظریے کو پیش کیا گیا ہے اس کو قرآن کریم نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ اس طرح بیان فرمایا ہے: خلقنٰکم من نفسه واحدة "اور ہم نے پیدا کیا تم کو نفسِ واحد سے" اقبال کے نزدیک ہر موج سمندر میں رہ کر اپنی انفرادی حیثیت قائم رکھتی ہے اور سمندر سے الگ ہو کر اپنا وجود کھو بیٹھتی ہے، اسی طرح ماہِ نو، نقد و نظر، کائنات (ہدایت گڑھ) صحیفہ (لاہور) اور دوسرے کئی رسائل میں اقبال کے اشعار وقتاً فوقتاً موضوع بحث رہے ہیں۔ اقبال کا یہ شعر ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے　　بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

بہت دنوں تک حلقۂ اربابِ ذوق میں موضوعِ بحث رہا۔ ایک خیال کے مطابق اسے مہمل قرار دیا گیا اور دوسرے خیال کے مطابق اسے محض شاعرانہ اُپج تصور کیا گیا۔ اسے نہ صرف مہمل بلکہ بے ربط اور حقیقت کے خلاف بھی قرار دیا گیا۔ فیض الرحمان اعظمی نے "ماہِ نو" ۱۹۵۹ء کے جون کے شمارے میں "تفسیر معنی" کے عنوان کے تحت اس شعر کی حقیقت کو واضح کرتے ہوئے مذکورہ شعر پر عائد کئے گئے تمام اعتراضات کا ابطال کیا اور ثابت کر دیا کہ مذکورہ شعر میں ایک بدیہی حقیقت کو ایک بلیغ اشارے کے ذریعے سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اصل میں شرح اور شاعری کا آپس میں گہرا رشتہ ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے سے ہرگز جدا نہیں کیا جا سکتا۔ بہ الفاظِ دیگر شارح میں شعر فہمی کے علاوہ شعر گوئی کی

۱۔ شرح جاوید نامہ (پروفیسر یوسف سلیم چشتی)، ص ۷۔

صلاحیتوں کا ہونا ضروری ہے جب ہی وہ شعر کی قدر و قیمت اور تخلیقی سفر کے دوران شاعر کے یہاں تخلیقی کرب کی کیفیت کا انداز کر سکتا ہے۔ بقول اقبال "جہاں اچھا شعر دیکھ لو سمجھ لو کوئی نہ کوئی مسیح مصلوب ہوا ہے، اچھے خیال کا پیدا کرنا اوروں کے لئے کفارہ ہونا ہے"[1]۔

پروفیسر چشتی صاحب کی شرحیں اقبال کی شخصیت اور اُن کے تخلیقی شعور کو بہت حد تک واضح کرتی ہیں۔ چنانچہ اقبال کے شارحین میں انہیں ایک اہم مقام حاصل ہے، تاہم ان کی شرحیں بالعموم اقبال کے طالب علموں کے لئے زیادہ مفید ہیں۔ اس لئے کہ ان کی بیشتر توجہ کلام اقبال کی لفظی تشریح و تعبیر تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ آج تنقید ترقی کی نئی منزلیں طے کر چکی ہے اور جدید تنقید کی رُو سے نقاد یا شارح کا کام اتنا ہی نہیں کہ وہ کسی شاعر کے کلام کی لفظی تشریحات کر کے اس کے معنوی نظام تک رسائی حاصل کرے۔ اس لئے کہ جدید تنقیدی اصولوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ شاعری محض معنی و مطلب نہیں بلکہ لفظ و پیکر کی مناسبت اور ارتباط سے ایک پیچیدہ، نمو پذیر اور نادیدہ تجربے کی تشکیل ہے۔ اس تناظر میں دیکھئے تو چشتی صاحب کی شرحیں عدم تکمیلیت کا احساس دلاتی ہیں۔ علم ایک بحرِ بیکراں ہے اور بقول اقبال ؎ علم معنی کس حد اورانہ بست

ادب میں کوئی بات حرفِ آخر کا حکم نہیں رکھتی۔ کلامِ اقبال کی اس سے بھی زیادہ اچھی شرح لکھی جا سکتی ہے۔ دیکھئے ؎

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مردِ افگن عشق

۱۔ ملک حسن اختر، دائرہ معارفِ اقبال، ص ۱۵۴۔

زخاکِ خویش طلب آتشے کہ پیدا نیست

ایک مطالعہ

''پیامِ مشرق'' علامہ اقبال نے جرمنی کے مشہور شاعر اور حکیم گوئٹے کے مغربی دیوان کے جواب میں لکھی ہے۔ گوئٹے کے سوانح نگار ہائنا نے لکھا ہے کہ یہ وہ گلدستۂ عقیدت ہے جو مغرب نے مشرق کو بھیجا ہے۔ اقبال نے اپنی شاعری اور نثر دونوں میں پیرِ مغرب شاعر المانوی کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ اس دوران علامہ نے گوئٹے کے ساتھ اپنی فکری مماثلت کا ذکر بھی بڑے والہانہ انداز میں کیا ہے۔ اقبال نے مغربی تہذیب کا مشاہدہ خود اپنی آنکھوں سے بہت قریب سے کیا تھا۔ اس کے اسباب پر غور و فکر کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ جس تہذیب کی بنیاد مادیت اور الحاد پر ہو، اُس سے خطرناک بلکہ ہولناک نتائج کا برآمد ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مشرق و مغرب دونوں کو عشق کا پیغام دیا۔ ''پیامِ مشرق'' پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ سوم ''مئے باقی'' میں ۴۵ غزلیں درج ہیں۔ یہ غزلیں اقبال کے ابتدائی دور کی غزلوں سے مختلف ہیں۔ اقبال کے گہرے مطالعے، مشاہدے اور تجربے کی ارتقاء پذیری کے تحت ان غزلوں میں اقبال کے فکر و فن اور تہہ داری کے واضح ثبوت ملتے ہیں۔ بعض ناقدین کا خیال ہے کہ جہاں تک ان غزلیات کی زبان اور اندازِ بیان کا تعلق ہے۔ ان میں فارسی کے ممتاز شعراء حافظ شیرازی اور نظیری کا رنگ جھلکتا ہے تاہم اس حقیقت کو نظر انداز نہ کیا جائے کہ ان میں اقبال کی مخصوص انفرادیت ہر جگہ نمایاں طور پر غالب ہے کیونکہ ان میں جا بجا اقبال کے

مخصوص فلسفۂ حیات کی ترجمانی کی گئی ہے۔

زخاک خویش طلب آتشے کہ پیدا نیست

"پیام مشرق" کے حصہ سوم "مئے باقی" کی ۱۷ویں غزل ہے۔ مذکورہ غزل میں اقبال کے پیغام کے مختلف اجزاء عرفان نفس یا تعین ذلت، تحفظ خودی، عشق حقیقی، معرکۂ حق و باطل، عقل پر عشق کی فضیلت اور موخرالذکر کی نصرت و فتح، اسلام کے زرّین اصولوں کی تفہیم اور ان پر عمل پیرا ہونے کی تلقین، اپنے نفس میں استغراق پیدا کرنے اور معرفت نفس حاصل کرنے، نفسِ امارہ پر قابو پانے اور زندگی میں خطر طلبی یا خطر پسندی کی تلقین کی گئی ہے۔

اقبال نے اپنے پیغام کے ان اجزاء کی اپنی تصانیف میں مختلف مقامات پر تلقین کی ہے۔ ان اجزاء کی رہ رہ کر تلقین کرنے کا یہ مقصد ہے کہ قاری کسی نہ کسی طریقہ سے ان پر عمل پیرا ہو۔ اقبال کی نثری اور شعری تصانیف کا بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اس بات کی شکایت رہی ہے کہ ان کی قوم کا اُن کے پیغام پر عمل پیرا ہونا تو درکنار وہ اسے سننا بھی گوارا نہیں کرتی۔ تاہم وہ مستقبل سے قطعی طور پر مایوس نہیں۔ دس اشعار پر مشتمل مذکورہ غزل "پیام مشرق" کے علاوہ جاوید نامہ میں بھی نوائے حلاّج کے عنوان سے درج ہے۔ جاوید نامہ میں اس غزل کو منتخب کرنے کا سبب یہ ہے کہ یہ غزل حسین بن منصور حلاّج کے مسلک کے عین مطابق ہے۔ حسین بن منصور حلاّج کے مطابق خدا خارج میں نہیں بلکہ انسان کے باطن میں موجود ہے۔ اُس کے اندر ہے اور اگر انسان اُسے تلاش کرنے کی کوشش کرے تو اُسے چاہیے کہ دنیا کی سیر کرنے کی بجائے وہ اپنے عالم دل کی سیر کرے۔ بقول اقبال ؎

کرا جوئی؟ چرا در پیچ و تابی — کہ او پیداست تو زیر نقابی

تلاش او کنی جز خود نہ بینی — تلاش خود کنی جز او نیابی

یا ؎

جنہیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں — وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں

زیر بحث غزل کے پہلے شعر کے مطالعے سے ہمارا ذہن ''پیامِ مشرق'' کی خوبصورت اور دلکش نظم ''تنہائی'' کے مرکزی خیال کی طرف منعطف ہوتا ہے جس میں اقبال فطرت کے تین اہم اور بڑے مظاہر سمندر، پہاڑ اور چاند سے استفسار کرتا ہے کہ کیا وہ بھی میری طرح کسی کے عشق میں مبتلا ہیں لیکن یہ تینوں مظاہر یکے بعد دیگرے اس گوہر نایاب سے اپنی محرومی یا تہی دامنی کا خاموش اظہار کرتے ہیں۔ اس حقیقت کو خواجہ حافظ نے اپنے ایک مشہور شعر میں بڑی فن کاری کے ساتھ بیان کیا ہے۔ شعر ملاحظہ کیجئے۔

آسمان بار امانت نتواست کشید قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

یعنی کائنات میں صرف انسان ہی ایک ایسی ہستی ہے جو عشق حقیقی یا بارِ امانت کو اٹھانے پر آمادہ ہوئی۔ زیر بحث غزل کے پہلے شعر میں بتایا گیا ہے کہ انسان بظاہر خاک کا پتلا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس خاک کے پتلے کو جذبۂ عشق سے سرفراز کر کے اسے دنیا کی تمام تر مخلوقات پر شرف بخشا ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی خودی کی تربیت کر کے اسے مستحکم کر دے۔ یعنی اپنے اندر کی اس آگ کو ہوا دے کر شعلوں میں تبدیل کر دے لیکن انسان اس مشکل کام کو تن تنہا کیسے انجام دے۔ اس کے لئے مرشد کی صحبت ناگزیر ہے جو سالک کے اندر چھپی ہوئی عشق کی اس آگ کو ہوا دے اور اسے شعلوں میں تبدیل کرنے میں اُس کی معاونت کرے، اسی لیے انسان اگر تجلّی کا آرزومند ہے تو اُسے اپنی تجلّی کو دیکھنا چاہیے کیونکہ سب کچھ اس کے اندر ہے۔ دوسرے کی تجلّی تقاضے کے لائق نہیں۔ اقبال کے نزدیک من کی دنیا میں مستغرق ہو کر ہی سراغ زندگی پایا جا سکتا ہے۔ کیونکہ

من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں

بال جبریل کی اس غزل میں من کی دنیا کا تن کی دنیا کے ساتھ موازنہ کر کے اوّل الذکر کو اصل مرکز قرار دے کر اسے فضیلت عطا کی گئی ہے۔ اگر اس تشریح کو دوسرے لفظوں میں من عرف نفسه فقد عرف ربه سے تعبیر کیا جائے تو غالباً غلط نہ ہوگا۔ اپنی معرفت حاصل کرنے والے ہی خدا کی معرفت حاصل کر لیتے ہیں۔ دوسرے شعر کا جہاں تک تعلق

ہے، اقبال کے فلسفۂ عشق کے مطابق عشق اصل حیات ہے۔ عشق اور مسلم لازم وملزوم ہیں۔ حتیٰ کہ ؎ مسلم از عاشق نباشد کافراست۔ اقبال عشق حقیقی کے قائل ہیں۔ اس کا اندازہ اُن کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے سے بخوبی ہوتا ہے۔ عشق مجازی یا عورت سے عشق کو وہ عشق کی نہایت گھٹیا صورت سے تعبیر کرتے ہیں ؎

ابتدا پیش بُتاں افتادگی　　انتہا از دِلبراں آزادگی

اقبال کے نزدیک فرہاد کا شیرین کے عشق میں جوئے شیر بہانا ''آنچہ مقام گفتگوست'' کیونکہ عشق میں تو سلسلہ ہائے کوہ ہی کو اُٹھا دینے کی طاقت ہے۔ اقبال کے یہاں عشق خودی کی تکمیل کا ایک بڑا وسیلہ ہے کیونکہ اس کی بدولت عمل کی بے پناہ قوت پیدا ہوتی ہے۔ اقبال ذات ایزدی سے محبت اور محبوب خدا رسول محترمؐ کی ذاتِ اقدس سے عشق کی ارفع ترین صورت قرار دیتے ہیں۔ اُن کے نزدیک جو مسلمان عاشق رسولؐ نہیں وہ کافر و زندیق ہے۔ غزل کے دوسرے شعر کے حوالے سے اقبال کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص مجھے نظیری کے مصرعے کا انکار کرنے کے عوض جمشید کی پوری سلطنت بھی دے دے تو بھی مجھے ہرگز قبول نہیں۔ نظیری کے مصرعے کا مفہوم اس طرح ہے کہ جس نے اپنی جان معشوق پر قربان نہ کی، وہ ہمارے قبیلے میں شامل نہیں ہوسکتا۔ اقبال نے فارسی کے ممتاز شعراء حافظ، سعدی، بیدل، رومی اور خاقانی کے علاوہ نظیری کے کلام کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ زیر بحث غزل نظیری کی زمین میں لکھی گئی ہے۔ تیسرے شعر میں عقل اور عشق کا موازنہ کرکے عشق کی برتری واضح کرکے اس کی کامیابی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کہ اقبال عشق کے قائل ہیں لیکن عقل کی اہمیت سے بھی اُنہوں نے انکار نہیں کیا ہے۔ قرآن وحدیث اقبال کی فکر کے سرچشمے ہیں اور ان میں انسان کو بار بار تفکر اور تدبر سے کام لینے کی تلقین کی گئی ہے۔ عقل چراغ راہ ضرور ہے لیکن اسے منزل نہیں سمجھنا چاہیے اور منزل کو عقل سے نہیں بلکہ عشق کی مدد سے پایا جاسکتا ہے۔ عقل کا دارومدار قیاس آرائی پر ہے اور قیاس آرائی میں اکثر وبیشتر غلط فہمی کا احتمال رہتا ہے۔ بے شک عقل سخن درازی کند لیکن طول طویل مباحث سے

لذتِ نظر نصیب نہیں ہو سکتی۔ یہ دولت بے بہا تو عشق ہی سے مخصوص ہے ؎

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں　　ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

تیسرے شعر کی رُو سے اگرچہ عقل نے اپنی عیّاری کے سبب عشق کو زیر کرنے یا اسے مغلوب کرنے کی خاطر منکرین خدا یا عناصر شر کی ایک بہت بڑی جماعت تیار کر کے عشق کے خلاف ایک محاذ کھڑا کیا ہے تو کوئی غم نہیں، عشق بھی تنہا نہیں ہے۔ ایک بہت بڑی جماعت بھی اس کے ساتھ ہے جو کُل کائنات کی خالق ہے اور اگر تم اس خالق حقیقی سے ناطہ جوڑ کر اس کی اطاعت کر لو تو عشق کی کامیابی یقینی ہے۔ چوتھے شعر کی نسبت پروفیسر یوسف سلیم چشتی لکھتے ہیں۔ ''رہ یا راہ اور مقام ایرانی موسیقی میں دو راگنیوں کے نام ہیں۔ نغمہ سے دلکش تعلیمات مراد ہیں اور بربط سلیمیٰ سے شریعت اسلامیہ مراد ہے۔ سلیمیٰ ایک عربی حسینہ کا نام ہے جسے فارسی ادب میں عذرا اور ہندی ادب میں شکنتلا، مطلب یہ ہے کہ اے مخاطب! تو حقیقت حال (راہ و مقام) سے آگاہ نہیں، ورنہ وہ کون سی خوبی ہے جو اسلامی تعلیمات میں موجود نہیں۔ راہ اور مقام چونکہ موسیقی کی اصطلاحیں ہیں اس لئے نغمہ اور بربط سے مناسبت کی بناء پر ان لفظوں میں خوبی پیدا ہو گئی ہے، جسے صنعت ایہام سے تعبیر کرتے ہیں''۔ پانچویں شعر میں ایک مرتبہ پھر دل کی دنیا میں استغراق پیدا کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ اقبال کے کلام میں معرفت نفس، معرفت ذات، عرفان نفس یا خود شناسی کی رہ رہ کر تلقین کی گئی ہے۔ ذاتِ حق حسن کُل ہے، حسن کا منبع یا سرچشمہ ہے اور اسی حسن کے سرچشمے کے جلووں کا ہم پوری کائنات میں مشاہدہ کرتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک میں اپنے دل کی دنیا میں اپنی ذات کے مشاہدے میں اس قدر مستغرق ہوں کہ مجھے اس دنیا سے باہر نکل کر اس آب و گل کی دنیا کی طرف توجہ کرنے کی فرصت ہی نہیں۔ چھٹے شعر میں بتایا گیا ہے کہ طالبانِ حق یا خدا کے سچے عاشق جنگلوں میں مارے مارے نہیں پھرا کرتے۔ اس شعر میں اُن راہبوں کے طریقۂ کار پر سخت تنقید کی گئی ہے جو خدا تک رسائی پانے کے لئے اس مادّی دنیا کو ترک کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لیتے ہیں جب کہ خدا تک پہنچنے کا ذریعہ ترک دنیا نہیں

بلکہ اس کائنات کو مسخر کرنا ہے اور اسے مسخر کر کے خدا کی رضا اور خوشنودی کے لئے ترک کرنا ہے تاکہ دنیا میں حق کا بول بالا ہو۔ ساتویں شعر میں نفس امارہ اور اس کی تحریکات پر قابو پانے کی تلقین کی گئی ہے۔ نفس انسانی سرکش ہے اور یہ ہر وقت برائی کا حکم دے کر اسے حق و خیر کے راستے میں مزاحم رہتا ہے۔ سب سے بڑا جہاد یہ ہے کہ انسان اپنے نفس پر قابو پائے کیونکہ جو شخص نفس امارہ یا نفسانی خواہشات کا غلام ہو جاتا ہے، وہ ان خواہشات کو اپنا معبود بنا لیتا ہے۔ ایک انسان جب ہی خدا اور رسول کا فرمانبردار ہو سکتا ہے جب وہ اپنے نفس کو قابو میں رکھے۔ کام، کرودھ، موہ، لوبھ اور اہنکار انسان کے ازلی دشمن ہیں۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ رسولؐ سے اس طرح مخاطب ہے۔ اے رسولؐ! کیا آپؐ نے اُس شخص کے انجام پر غور کیا جس نے مجھے چھوڑ کر یا میرے بجائے اپنی نفسانی خواہشات کو اپنا معبود بنا رکھا ہے۔ کیا آپؐ ایسے بد بخت انسان کی حمایت کر سکتے ہیں''۔ اسی لئے اقبال نے ضبط نفس کو خودی کے استحکام کی دوسری شرط قرار دیا ہے۔ آٹھویں شعر میں انسان کی ہمت کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ کہتے ہیں کہ خودی اُسی وقت پختہ ہو سکتی ہے جب انسان مشکلات سے برسر پیکار ہو کر ان سے نبرد آزما ہو۔ اس لئے میں اُس شخص کا مرید ہوں جو اپنے لئے پُر خطر راستے کا انتخاب کر کے عزم و استقلال کا ثبوت دے اور جس کے پائے استقلال میں جنبش تک نہ آئے اقبال نے کئی مقامات پر انسان کو خطر پسندی یا خطر طلبی کی تلقین کی ہے۔

ے اگر خواہی حیات اندر خطر زی

ے بہ کیش زندہ دلاں زندگی جفا طلبی است

ے سفر بہ کعبہ نہ کردم کہ راہ پُر خطر است

نویں شعر میں شریک حلقہ رندان بادہ پیما باش کہہ کر سالک کو ایک ایسے پیر کی صحبت سے حذر کرنے کی ہدایت کی گئی ہے جو مرد غوغانہ ہو اور جو سالک کے اندر انقلاب بپا نہ کر سکے۔ دسویں اور آخری شعر میں شاعری میں رمز و ایماء کی اہمیت کا اعتراف کیا گیا ہے۔ شاعر جب اپنے مافی الضمیر کا براہ راست اظہار کرتا ہے تو اس میں وہ تاثیر پیدا نہیں ہوتی۔ جو رمز و

ایماء کے ذریعے کہی گئی بات میں ہوتی ہے۔ شاعر جب رمز وایماء میں بات کرتا ہے تو قاری اس کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے غور وفکر سے کام لینے پر مجبور ہو جاتا ہے اور اس طرح بات اُس کے ذہن پر نقش ہو جاتی ہے۔ حدیث خلوتیاں سے اُن عارفوں کی گفتگو مراد ہے جو خلوت میں بیٹھ کر یادِ الٰہی میں مصروف رہتے ہیں اور پھر رمز وایماء کے ذریعے اپنی بات سننے والوں تک پہنچا دیتے ہیں، عارفوں کی گفتگو صاف اور واضح نہیں ہوتی۔

بھٹکے ہوئے آہُو کو پھر سُوئے حرم لے چل

اقبال کی شاعری کے کسی بھی پہلو یا موضوع کو زیرِ بحث لانے کی خاطر اقبال کے فکری اور شعری میلانات، مطالعات اور اس نوع کے دیگر عناصر کا مطالعہ کرنا ازبس ضروری ہے۔ ایک عظیم فن کار کی طرح اقبال کی شاعری اپنے اندر بڑی وسعت، تنوع، ہمہ گیری اور تہہ داری رکھتی ہے۔ اقبال کی شاعری کا باقاعدہ ایک فکری ارتقاء ملتا ہے، اُسی طرح جس طرح ایک بڑے فن کار کے یہاں فکر کا ارتقاء ملتا ہے۔ اقبال ایک بڑے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بڑے مفکر کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ اُن کی شاعری اور فکر کو دو الگ الگ خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ اُن کے یہاں کسی باقاعدہ نظامِ فکر کی تلاش کرنا بھی بے سود ہے۔ اقبال نے مشرقی فکر کے ساتھ ساتھ مغرب کے مفکرین کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ اُن کی نگاہ بڑی نکتہ رس، مطالعہ وسیع، مشاہدہ تیز اور فہم و ادراک بڑے غضب کا تھا۔ اُن کی شاعری پورے بنی نوع انسان کے لئے پیغامِ حیات کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس طرح اقبال کے پیغام کی نوعیت عالمگیر یا آفاقی ہے، اس میں مذہب و ملت اور رنگ و نسل کی کوئی تخصیص نہیں تاہم اُن کی شاعری کا بیشتر حصہ ایسا ہے جس میں براہِ راست مسلمانوں سے خطاب کیا گیا ہے۔ یہ سلسلہ ''بانگِ درا'' سے لیکر کے اُن کے آخری مجموعۂ کلام ''ارمغان حجاز'' تک جاری رہا ہے۔ غالباً اسی سبب کے تحت اقبال کو مسلمانوں کا شاعر کہا گیا ہے۔ اقبال کو صرف مسلمانوں کا شاعر قرار دیکر کے انہیں ایک خول میں بند کر دینا یا اُن کے شعری اور فکری کینوس کو محدود کر دینا ہرگز صحیح نہیں۔ اُن کا شعری اور فکری کینوس وسعت اور تنوع کا حامل ہے۔ اقبال جب مسلمان سے مخاطب ہوتے ہیں تو مسلمان سے اُن کی مراد وہ انسان ہے

جو نہ صرف نام کے اعتبار سے مسلمان ہو بلکہ جس کے اعمال مسلمان کے ہوں، اس طرح مسلمان کا لفظ انہوں نے وسیع تناظر میں استعمال کیا ہے۔

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے　　لوگ سمجھتے ہیں کہ آسان ہے مسلمان ہونا

یہ بات مسلم ہے کہ اقبال مسلمانوں کے تئیں ایک والہانہ جذبہ رکھتے تھے۔ چنانچہ ایک حساس اور باشعور مسلمان ہونے کے ناطے وہ مسلمانوں کے انحطاط وزوال پر سنجیدگی کے ساتھ غور وفکر کرتے رہے اور اس کے سدباب کے لئے راہیں تلاش کرتے رہے۔ انہیں شدید احساس تھا کہ مسلمانوں کا ماضی بڑا پُرشکوہ اور شاندار رہا ہے اور پھر اس پُرشکوہ اور شاندار ماضی کے پس منظر میں جب وہ موجودہ دور کے مسلمانوں کی حالت کا مشاہدہ کرتے ہیں تو انہیں بڑا دُکھ ہوتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی حالت زار پر ان کی شاعری میں شدید ردعمل ملتا ہے۔ یہ ردعمل کہیں جوابِ شکوہ کی شکل میں ظاہر کیا گیا ہے۔ کہیں اس نے کوئی اور صورت اختیار کی ہے، غرض ہر شکل وصورت کی پیش کش سے اقبال کا یہی مقصود ہے کہ وہ مسلمان جو ایک زمانے میں رگِ باطل کے لئے ایک نشتر کی حیثیت رکھتا تھا، وہ مسلمان جو کبھی بُت شکن تھا اور وہ مسلمان جو کبھی پوری دنیا کے لئے ایک نمونہ تھا، وہی مسلمان جو اب اپنے اخلاق اور کردار کی پستی، یا گراوٹ کے لحاظ سے یہود ونصاریٰ سے بھی بدتر ہو چکا ہے، از سرنو اپنی عظمت رفتہ کو حاصل کرنے کے لئے سرگرم ہو۔ چنانچہ یہی مسلمان جب اپنے خدا کے حضور مسلمانوں کو نظر انداز کرنے اور غیروں پر فیض وکرم کی بارش کرنے پر شکوہ سنج ہوتا ہے تو اقبال اُسے اُس کی نکوکاری کا آئینہ دکھا کر اُسے شرمسار ہونے کا موقع دیتے ہیں تاکہ وہ اپنے اسلاف کے نقشِ قدم پر چل کر حقیقی معنوں میں مسلمان کہلانے کا اہل ہو سکے۔

جن کو آتا نہیں دنیا میں کوئی فن تم ہو　　نہیں جس قوم کو پروائے نشیمن تم ہو
بجلیاں جس میں ہوں آسودہ وہ خرمن تم ہو　　بیچ کھاتے ہیں جو اسلاف کے مدفن تم ہو
ہو کر نکو نام جو قبروں کی تجارت کر کے
کیا نہ بیچو گے جو مل جائیں صنم پتھر کے؟

خلیفہ عبدالحکیم کے الفاظ میں ''مسلمانوں کے اعمال اوران کی سیرت کا صحیح نقشہ وہی ہے جو ''جوابِ شکوہ'' میں خدا کی زبان سے بیان ہوا ہے''[1]۔ مسلمان کے برے اور قبیح اعمال کی تصویر کشی کے پس پشت اقبال کا یہی مقصد کارفرما ہے کہ وہ اپنے کردار کی اصلاح کر کے بنی نوع انسان کے لئے ایک نمونہ بن جائے۔ اقبال حقیقی معنوں میں حکیم الامّت تھے۔ کیونکہ انہوں نے امت مسلمہ کے انحطاط وزوال پر نہ صرف شدید ردعمل کا اظہار کیا ہے بلکہ وہ اس مرض کی تشخیص اور علاج کرنا بھی بخوبی جانتے تھے۔ اُن کے نزدیک امت مسلمہ کے انحطاط وزوال کا بنیادی سبب مسلمان کا تارکِ قرآن اور تارکِ آئین رسول مختارؐ ہونا ہے۔

گر تو می خواہی مسلمان زیستن نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

اور

کچھ بھی پیغامِ محمدؐ کا تمہیں پاس نہیں

اقبال کو شکوہ ہے کہ مسلمان کا قلب سوز سے عاری ہے اور اس کی روح احساس سے نابلد ہے۔ اُسے شعارِ صاحب یثرب کا کوئی پاس نہیں۔ انہیں یقین ہے کہ مسلمان قرآن کو اپنا رہبر بنائے۔ قانون الٰہی کی پابندی کرے، اور سنتِ رسولؐ کی پیروی کرے، تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ پھر سے دنیا میں عزت وسرخروئی حاصل نہ کرے۔ اقبال کی فکر کا سرچشمہ قرآن پاک ہے۔ انہوں نے ایک مقام پر حلفیہ بیان دے کر کہا ہے کہ اگر میں نے اپنی شاعری میں قرآن کے سوا کسی اور چیز کو پیش کرنے کی کوشش کی ہو تو خدا روزِ محشر کو نبی برحقؐ کے پائے نازنین کے بوسے سے مجھے محروم کردے۔ قرآن پاک کے بعد اقبال نے اپنے مرشد معنوی مولانا روم کی مثنوی سے فیضان حاصل کیا ہے۔ اپنے آخری ایام میں علالت کے دوران جب انہوں نے کتابوں کا مطالعہ کرنا تقریباً ترک ہی کردیا تھا، صرف یہی دو کتابیں اُن کے زیر مطالعہ رہتی تھیں۔ اُن کی فکر کے یہ دونوں سرچشمے اُن کی تخلیقات کو جلا بخشتے رہے ہیں۔ اقبال کو امت مسلمہ سے کس قدر والہانہ لگاؤ اور ہمدردی تھی، اس کا اندازہ اُن

۱۔ خلیفہ عبدالحکیم، فکر اقبال، ص ۹۸

کے کلام کے بالاستیعاب مطالعے سے ہوتا ہے۔ وہ اس قوم کو عروج کی انتہا پر دیکھنے کے دل سے خواہاں ہیں۔ ''بانگِ درا'' کی ایک نظم بعنوان ''دُعا'' میں اپنی قوم کے پھر سے عظمت رفتہ حاصل ہونے پر یوں دست بدعا ہیں ؎

یارب دل مسلم کو وہ زندہ تمنا دے — جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے
پھر وادیٔ فاراں کے ہر ذرّے کو چمکا دے — پھر شوقِ تماشا دے پھر ذوقِ نظارہ دے
محرومِ تماشا کو پھر دیدۂ بینا دے — دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دے
میں بلبلِ نالاں ہوں اک اُجڑے گلستاں کا — تاثیر کا سائل ہوں محتاج کو داتا دے

اقبال نے خوابیدہ قوم کو بیدار کرنے اور اس میں ایک نئی روح پھونکنے کی جا بجا کوشش کی ہے لیکن جب ملت اسلامیہ میں انہیں اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ وہ ایک ایسی خوابیدہ اور غافل قوم کو بیدار کرنے کی کوشش کر رہا ہے جو احساس سے عاری ہے، نہ اس کے جوان ہمت خواہ ہیں اور نہ ہی اس کے پیر دل بیدار رکھتے ہیں ؎

کہاں اقبال تو نے آہ بنایا آشیاں اپنا — نوا اس باغ میں بلبل کو ہے سامانِ رسوائی

قوم کی ناگفتہ بہ حالت کے مناظر دیکھ کر جب اُن سے خاموش نہیں رہا جا سکتا تو خود ہی اپنے آپ کو کسی صحرا کی تنہائی اختیار کرنے کا مشورہ دیتے ہیں ؎

نہیں ضبطِ نوا ممکن تو اڑ جا اس گلستاں سے — کہ اس محفل سے خوشتر ہے کسی صحرا کی تنہائی

مگر اقبال کے یہاں یہ یاس اور افسردگی مستقل نہیں بلکہ ایک عارضی یا اضطراری کیفیت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور پھر زندگی امید و بیم کی باہمی کش مکش کا نام ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یاس انگیزی اور افسردگی اقبال کا شیوہ نہیں۔ یاس کی ان آتی جاتی عارضی لہروں کے باوجود اُن کے کلام میں امید کی کرنیں بڑی ہی روشن اور تابناک نظر آتی ہیں۔ اور پھر اسلام اور مسلمانوں کا نصب العین خود بھی تو اپنی زبان سے کہتا ہے۔

''آخر کار کیا یہ صداقت نہیں کہ توحید ہی حقیقت کائنات ہے اور خدا نے مجھے اس کا شاہد بنایا ہے۔ اگر یہ تصور مٹ گیا تو نوع انسان رسوا ہو جائے گی''۔ [1]

۱۔ خلیفہ عبدالحکیم، فکرِ اقبال، ص ۱۱۰۔

اور پھر یہ اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

ہم نشیں! مسلم ہوں میں توحید کا حامل ہوں میں
اس صداقت پر ازل سے شاہدِ عادل ہوں میں

نبضِ موجودات میں پیدا حرارت اس سے ہے
اور مسلم کے تخیل میں جسارت اس سے ہے

حق نے عالم اس صداقت کے لئے پیدا کیا
اور مجھے اس کی حفاظت کے لئے پیدا کیا

قسمتِ عالم کا مسلم کوکبِ تابندہ ہے
جس کی تابانی سے افسونِ سحر شرمندہ ہے

کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے
ہے بھروسا اپنی ملت کے مقدر پر مجھے

یاس کے عنصر سے ہے آزاد میرا روزگار
فتحِ کامل کی خبر دیتا ہے جوشِ کارزار

سامنے رکھتا ہوں اس دورِ نشاط افزا کو میں
دیکھتا ہوں دوش کے آئینے میں فردا کو میں

''بانگِ درا'' میں مشاہیر پر اقبالؔ کی نظمیں

کوئی بھی بڑا شاعر جب کسی دوسرے بڑے شاعر پر نظم لکھتا ہے تو بات ظاہر ہے کہ وہ اس کی شاعری سے یا اس کے کردار کے کسی نہ کسی غیر معمولی پہلو سے متاثر ہو کر اسے خراج تحسین پیش کرتا ہے اور اس کے فن کی تعین قدر بھی کرتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک شاعر دوسرے شاعر پر نظم کیوں لکھتا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ جب کسی بڑے شاعر کے تنقیدی اور شعری معیار کی کسوٹی پر کسی دوسرے شاعر کا کلام پورا اُترے تو اس شاعر کے کلام سے وہ یقینی طور پر متاثر ہو کر اس پر اظہار خیال کرنا چاہتا ہے۔ ایک نابغہ روزگار شخصیت کا کسی دوسرے شاعر پر نظم لکھنا بڑی معنویت رکھتا ہے۔ کسی بھی بڑے فن کار کو خراج تحسین پیش کرنے اور اُس کی فن کارانہ عظمت کا اعتراف کرنے اور اُس کے فن کی قدر سنجی کی مختلف صورتیں ہیں۔ مثال کے طور پر اُس پر کوئی نظم لکھ کر یا اس کے کسی شعر یا اشعار پر تضمین کرنے کی شکل میں، یا اُس کا تتبع کرنے کی صورت میں وغیرہ وغیرہ۔ اُردو شاعری میں مشاہیر کو خراج تحسین پیش کرنے کے متعدد نمونے ملتے ہیں اور ان تمام نمونوں کو یکجا کر کے ایک وافر اور گرانقدر سرمایہ جمع ہو سکتا ہے۔ بڑے بڑے شعراء اپنے پیشروؤں یا اپنے عہد کی ممتاز شخصیات کے کارناموں کے پیش نظر انہیں خراج تحسین پیش کرتے رہے ہیں۔ ان ممتاز ہستیوں سے شعراء حضرات کی کوئی نسبت رہی یا نہ رہی ہو، لیکن شاعرانہ نسبت کے رہنے کا ضرور علم ہوتا ہے۔ خود حکیم الامت علامہ اقبال کو تقریباً ہر چھوٹے بڑے شاعر نے خراج پیش کرتے ہوئے اُن کے کارناموں کی قدر سنجی کی کوشش کی ہے۔ اس نوع کی نظموں کا انتخاب ذوالفقار احمد تابش نے ''نذرِ اقبال'' کے عنوان سے مرتب کیا ہے۔ اس انتخاب میں مختلف

شعراء نے علامہ اقبال کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کے کارناموں کی قدر سنجی کی کوشش کی ہے۔ جہاں تک اقبال کی شاعری کا تعلق ہے انہوں نے اپنے اُردو اور فارسی کلام دونوں میں شاعری فلسفہ، تاریخ اور کئی دیگر شعبوں سے تعلق رکھنے والی معروف شخصیات پر نظمیں لکھ کر انہیں خراج پیش کیا ہے۔ اقبال کی اس قبیل کی نظموں سے ان مشاہیر کے صحیح مقام و مرتبے کا تعین کرنے میں خاصی مدد ملتی ہے۔ اقبال کی اس نوع کی نظموں کو اُردو اور فارسی شعر و ادب میں اُن کے گرانقدر اضافے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ نظمیں اقبال کی ادب نوازی، بالغ نظری، باریک مشاہدے، وسیع اور گہرے مطالعے اور مشاہیر کی قدر سنجی کے احساس اور کئی دوسری خوبیوں کا احاطہ کرتی ہیں۔ اقبال نے ان نظموں میں مختلف شعراء، ادباء اور مفکرین کے متعلق اپنے تنقیدی خیالات کا اظہار منظوم پیرائے میں کیا ہے۔ یہ نظمیں تفنن طبع، من کی موج یا منہ کا مزا بدلنے کی خاطر نہیں لکھی گئی ہیں۔ اور نہ ہی ان نظموں کی تخلیق سے اقبال کا مقصد شعراء ادباء اور مفکرین کی جھوٹی تعریفوں میں زمین و آسمان کے قلابے ملانا ہے۔ اقبال کے نزدیک شعر شاعر کے ذہن سے نہیں بلکہ اس کی روح سے برآمد ہوتا ہے۔ اقبال کے نزدیک شاعر کا مقصد انسان کی اخلاقی اور روحانی تعمیر و ترقی ہونا چاہیے، اسی طرح زبان کو وہ اظہار مطالب کا ایک انسانی وسیلہ قرار دیتے ہیں نہ کہ ایک بُت جس کی پرستش کی جائے۔ ان کے نزدیک زندہ زبان انسانی خیالات کے ساتھ ساتھ تغیر پذیر ہوتی ہے، جس فن کار کے نظریات میں اس قدر فعالیت، تحرک، بلند خیالی اور مقصد آفرینی کارفرما ہو، ظاہر ہے کہ وہ اپنے عہد کی کسی بھی ادبی شخصیت کو جب موضوع شعر بنائے تو اس کی Evaluation میں اُس کے نظریات شعر کا کارفرما ہونا کس قدر ناگزیر ہو سکتا ہے۔ اس کا اندازہ مشاہیر پر لکھی ہوئی اقبال کی نظموں سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ مشاہیر پر لکھی گئی اقبال کی نظمیں صرف اُن کے اردو کلام تک محدود نہیں بلکہ اپنے فارسی کلام میں بھی انہوں نے بعض مشاہیر کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ یہ مقالہ خاصی طوالت کا باعث ہوگا۔ اگر اس میں تمام مشاہیر پر لکھی ہوئی اقبال کی نظموں کا احاطہ کیا جائے۔ بہتر یہی ہوگا کہ اُن

کے کسی ایک مجموعہ کلام سے ایسی نظموں کا انتخاب کیا جائے۔ چنانچہ زیرِ نظر مقالے میں اس مقصد کی خاطر صرف ''بانگِ درا'' پر اکتفا کیا گیا ہے۔ ''بانگِ درا'' کی اس قبیل کی نظموں کے عنوانات اس طرح ہیں۔ مرزا غالب، داغ، عبدالقادر کے نام، حالی و شبلی، نالۂ فراق (آرنلڈ کی یاد میں)، عرفی، شکسپیر، ہمایوں وغیرہ وغیرہ۔

بانگِ درا (۱۹۲۴ء) اقبال کا پہلا اردو شعری مجموعہ ہے۔ اس میں شامل مرزا غالب کے زیرِ عنوان نظم میں اقبال جیسا عظیم شاعر اور مفکر غالب جیسے عظیم شاعر اور مفکر کو خراج پیش کر رہا ہے۔ اقبال کے یہاں پورے بنی نوع انسان کے لئے ایک پیغام ہے اور اس پیغام کو عالمگیر حیثیت حاصل ہے اور غالب زندگی کی تلخ سچائیوں کے شاعر ہیں۔ تاہم اقبال اور غالب دونوں کے یہاں چند چیزیں مشترک ہیں، اور ویسے بھی اگر ہم دنیا کی بڑی زبانوں کے ادب کا مطالعہ کریں تو کئی چیزیں مماثل اور مشترک نظر آئیں گی۔ کہتے ہیں کہ Great Minds Think Alike غالب کے عظیم شاعر ہونے میں کوئی کلام نہیں، تاہم انہیں اقبال کی طرح اپنی حیات میں وہ شہرت حاصل نہیں ہوئی جس کے وہ مستحق تھے۔ چنانچہ اس نابغہ کی قدر سنجی میں بڑی تاخیر سے کام لیا گیا۔ بقول انہیں کے ؎

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا

اس تاخیر، بے التفاتی اور ناقدردانی کا احساس انہیں زندگی بھر رہا۔ اس کا اظہار انہوں نے اپنے کلام میں کئی مقامات پر کیا ہے۔ اُن جیسا نابغہ genius کسی ستائش یا صلے کی تمنا اور پرواہ سے بے نیاز ہو کر ہر صدی پر اپنی گہری چھاپ چھوڑ جاتا ہے۔ غالب کا تخلیقی ذہن اور ان کی مستقبل شناسی حال کے آئینے میں مستقبل کو دیکھنے کا غیر معمولی شعور اور ادراک رکھتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں ناقدین غالب شناسی اور تفہیم غالب کا بھرپور حق ادا کرنے پر مجبور ہو گئے۔ حکیم الامت محمد اقبال جیسے عظیم مفکر شاعر نے غالب کے بلند مقام و مرتبے کا تعین کرتے ہوئے انہیں ان الفاظ میں خراج پیش کیا ؎

فکر انسان پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا ہے پرِ مُرغ تخیل کی رسائی تا کجا

تھا سراپا روح تو، بزم سخن پیکر ہوا زیب محفل بھی رہا محفل سے پنہاں بھی رہا
دید تری آنکھ کو اُس حسن کی منظور ہے بن کے سوز زندگی ہر شئے میں جو مستور ہے

نظم ''مرزا غالب'' میں اقبال نے غالب کی غیر معمولی شعری استعداد، تخیل کی بلند پروازی اور اعجاز سخن کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں جرمنی کے معروف شاعر گوئٹے کا ہم نوا قرار دیا ہے۔

نطق کو سو ناز ہیں ترے لب اعجاز پر محوِ حیرت ہے ثریا رفعت پرواز پر
شاہد مضمون تصدق ہے ترے انداز پر خندہ زن ہے غنچۂ دلی گل شیراز پر
آہ! تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے گلشن ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

اقبال غالب کی فن کارانہ عظمت کے معترف ہیں، غالب جیسے عظیم شاعر اور مفکر کو خراج پیش کرنے والوں کی کوئی کمی نہیں لیکن اُن کے فن کی عظمت اور اس کی قدر سنجی میں علامہ اقبال نے جس دقّتِ نظر سے کام لیا ہے، وہ واقعتاً انہیں کا حصہ ہے اور غالب جیسا فخر روزگار اس کا حقیقی معنوں میں حقدار ہے۔

محفل ہستی تری بربط سے ہے سرمایہ دار جس طرح ندی کے نغموں سے سکوتِ کوہسار
تیرے فردوسِ تخیل سے ہے قدرت کی بہار تری کشتِ فکر سے اُگتے ہیں عالم سبزہ وار
زندگی مضمر ہے تری شوخی تحریر میں تاب گویائی سے جنبش ہے لب تصویر میں

ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> ''اس نظم سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی اہمیت اقبال کی نظر میں اس لئے بھی ہے کہ غالب ایک تہذیب کا نمائندہ اور ایک عظیم فکری و ادبی روایت کا وارث و ترجمان بلکہ آخری وارث و ترجمان تھا، جس کے بعد جہان آباد یعنی دلی کے بام و در سراپا نالۂ خاموش بن گئے۔ گویا غالب کی قدر و قیمت اس لئے بھی ہے کہ وہ ان تہذیبی و فکری قدروں کا شناسا و معیار شناس تھا۔ جن کی معیار شناسی خود اقبال کے فکر و فن کا امتیاز خاص ہے۔ گویا اقبال کی نظر میں وہ ایک شخص تھا جو ان سے پہلے انہیں راستوں

اور شاہراہوں کا سراغ لگا چکا تھا۔ جن کی نشاندہی بعد میں انھوں نے کی۔"[1]

بانگ درا میں جو نظم "داغؔ" کے زیر عنوان درج ہے اس میں داغؔ کو جو اقبال کے قلمی استاد کی حیثیت رکھتے ہیں، خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ اقبال کی ابتدائی دور کی شاعری پر داغ کے اثرات صاف طور پر دیکھے جاسکتے ہیں، داغ کے رنگ میں لکھی گئی اقبال کی کئی غزلیات "بانگِ درا" اور باقیات اقبال مرتبہ سید عبدالواحد معینی بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔ لیکن اقبال ہمیشہ اس اثر کے اسیر ہو کر نہیں رہے بلکہ بہت جلد اس سے آزاد ہو کر شاعری کی دنیا میں اپنی ایک مخصوص اور منفرد آواز سے پہچانے جانے لگے۔ کسی ناقد نے بجا طور پر اقبال کی اس دور کی شاعری، جس میں وہ داغ کی تقلید کرتے رہے، صبح کاذب سے تعبیر کرتے ہوئے اسے آنے والی روشنی کا پیش خیمہ بتایا ہے، اقبال پھر بھی داغ کی جو اپنے وقت کے اساتذہ شعراء میں شمار ہوتے تھے، شاگردی پر ہمیشہ نازاں رہے ۔

مجھے بھی فخر ہے شاگردیٔ داغِ سخندان کا ۔۔۔ نسیم و تشنہ ہی اقبالؔ کچھ نازاں نہیں اس پر

تیرے جیسے کو کرڈالا سخن دان بھی سخنور بھی ۔۔۔ جناب داغؔ کی اقبالؔ یہ ساری کرامت ہے

حالانکہ اقبال داغ سے خط و کتابت کے ذریعے بہت ہی کم عرصہ تک اصلاح لیتے رہے اور بہت جلد داغ نے اقبال کی شاعری کو دیکھ کر کہا کہ اب آپ کا کلام اصلاح کا محتاج نہیں تاہم اقبال اپنی سخن دانی اور سخن وری کا Credit داغ ہی کو دیتے ہیں۔ بہرحال نظم "داغؔ" مرزا داغ کے سانحہ ارتحال پر لکھا گیا ایک پر درد مرثیہ ہے۔ اقبال کو اُس وقت بڑی تشویش تھی جب امیر مینائی کے بعد جہاں آباد کے آخری شاعر داغؔ بھی رخصت ہوگئے۔ نظم میں جہاں آباد کے اس آخری سخنور کے بانکپن، اُن کے یہاں طرزِ بیان کی شوخی، مضمون کی باریکیوں اور نزاکتوں، فکر کی بلند پروازی اور تخیل کی سراہنا کی گئی ہے۔ اقبال کو معلوم تھا کہ داغؔ کے انتقال کے بعد اور بھی نہ جانے کتنے ہی شاعر پیدا ہونگے جو صاحبِ اعجاز ہوں گے اور کتاب دل کی تفسیریں لکھیں گے اور جن سے خوابِ جوانی کی تعبیریں بھی

۱۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، مقامات اقبال، ص ۱۶۷۔

ہوں گی لیکن داغ جیسے ناوک فگن کا دوبارہ پیدا ہونا ممکن نہیں۔ اُن جیسی باکمال ہستی کے رخصت ہو جانے سے اُردو شاعری میں پیدا ہوئی وسیع خلیج پر اقبال یوں اشکبار ہیں ؎

اشک کے دانے زمین شعر میں بوتا ہوں میں　　تو بھی رو لے خاک دلی داغ کو روتا ہوں میں

اے جہاں آباد! اے سرمایۂ بزم سخن　　ہو گیا پھر آج پامالِ خزاں تیرا چمن

وہ گل رنگین تیرا رخصت مثالِ بو ہوا　　آہ! خالی داغ سے کاشانۂ اُردو ہوا

تھی نہ شاید کچھ کشش ایسی وطن کی خاک میں　　وہ مہ کامل ہوا پنہاں دکن کی خاک میں

اُٹھ گئے ساقی جو تھے میخانہ خالی رہ گیا　　یادگارِ بزم دہلی ایک حالی رہ گیا

زیر بحث نظم کے متعلق محمد عبداللہ قریشی کی رائے ملاحظہ ہو۔

"داغ کے کمال فن کا تجزیہ اس سے بہتر شاید ہی کسی نے کیا ہو۔ یہ اقبال کے تنقیدی رویے کی ایک نادر مثال ہے۔"[1]

خلیفہ عبدالحکیم کا یہ بیان دیکھئے۔

"داغ کی وفات پر اس کے سینکڑوں شاگردوں نے مرثیے لکھے جن کا اب کہیں نام و نشان نہیں لیکن اقبال نے جو مرثیہ لکھا وہ داغ کے کمالات کی صحیح تصویر ہے اور اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال داغ کے کلام سے کس قدر متاثر تھا۔"[2]

"عبدالقادر کے نام" بانگ درا کی وہ نظم ہے جو علامہ اقبال نے اپنے قریبی دوست اور رسالہ "مخزن" کے مدیر سر عبدالقادر کے نام ۱۹۰۸ء میں لکھی ہے۔ یہ نظم پہلے سر عبدالقادر کے رسالہ "مخزن" میں شائع ہوئی تھی بعد میں اسے بانگ درا ۱۹۲۴ء میں شامل کیا گیا۔ اس نظم کو اصل میں اُس عہد نامے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جو اقبال نے اپنے دوست سر عبدالقادر کے ساتھ اُس زمانے میں کیا تھا جب مشرق اپنی عظیم الشان روایات اور مذہبی

۱۔ محمد عبداللہ قریشی، معاصرین اقبال کی نظر میں، ص ۳۱۔

۲۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، فکر اقبال، ص ۱۹۔

اقدار سے بیگانہ ہوکر روبہ زوال ہورہا تھا۔ اور ایسے میں اقبال سر عبدالقادر کو اپنے نیک عزائم سے آگاہ کرتے ہوئے اسلام کی خدمت کرنے پر راغب کررہے ہیں۔ یہ امر قابلِ ستائش ہے کہ اقبال نے ۱۹۰۸ء میں سر عبدالقادر سے جو عہد کیا تھا وہ زندگی بھر اُسے نبھانے اور عملی جامہ پہنانے کی خاطر سعی پیہم میں مصروف رہے۔ اقبال کی دورس نگاہوں نے بھانپ لیا تھا کہ مشرق تاریکیوں میں لپٹا جارہا ہے چنانچہ اس وقت کی تاریکی کے پیش نظر انہیں مستقبل کی تیرگی کے خدشات یقینی نظر آنے لگے تھے۔ اس تاریکی کو دور کرنے کی خاطر انہوں نے امت مسلمہ کی خدمت کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ اقبال کو اپنی قوم سے بے پناہ عشق تھا۔ وہ اس قوم کی فلاح وبقاء کے لئے امت مسلمہ کے دلوں میں عشقِ رسول کی کبھی نہ سرد ہونے والی آگ بھڑکانا چاہتے تھے۔ اقبال سر عبدالقادر کو اس بات پر آمادہ کرتے ہیں کہ مسلمان قوم کو غیر اسلامی روایات کے چنگل سے نجات دلا کر انہیں عربی زبان، تہذیب اور روایات کا شیدائی بنائیں۔ اس نظم کے ساتویں شعر میں تلمیح برتی گئی ہے ؎

دیکھ یثرب میں ہوا ناقۂ لیلیٰ بیکار　　قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کردیں

پروفیسر یوسف سلیم چشتی کا یہ بیان ملاحظہ کیجئے:

"۱۹۰۸ء میں دمشق سے مدینہ منورہ تک ریل آگئی تھی۔ کہتے ہیں کہ دنیا میں ہر وقت انقلاب رونما رہتا ہے۔ چنانچہ دیکھ لو۔ مدینہ میں اونٹ بیکار ہوگئے ہیں۔ لہٰذا اب وقت آگیا ہے کہ مسلمان بھی اپنے اندر انقلاب پیدا کریں یا کم از کم اس کے لئے تیار رہیں"۔[1]

اقبال ۱۹۰۵ء میں انگلستان چلے گئے اور کئی برس وہاں رہ کر ۱۹۰۸ء کو لوٹے۔ مغربی ممالک میں رہ کر بھی جہاں علم اور سائنس کی بے پناہ ترقی کے ساتھ ساتھ انسان کے بہکنے اور بھٹکنے کے سامان قدم قدم پر دستیاب ہیں، اقبال کا کردار آلودگیوں سے پاک رہا۔ انہوں نے لندن میں بھی آدابِ سحرگاہی کے نہ چھوٹنے کا ذکر اپنی شاعری میں کیا ہے۔ زیر بحث نظم

۱۔ شرح بانگ درا (پروفیسر یوسف سلیم چشتی)، ص ۳۳۹

میں بھی اس طرف اشارہ موجود ہے کہ یورپ میں قیام کے دوران اگر ہم غیر اسلامی زندگی سے محفوظ رہے تو نہ صرف عشق رسول کی بدولت رہے۔ اس لئے دنیا کو اس لازوال نعمت سے روشناس کرانا ہمارا فرض ہے۔ نظم کے اختتام پر اقبال نے سر عبدالقادر کو اس دنیا میں شمع کی مانند جینے پر آمادہ کیا ہے جو خود تو جل کر ختم ہو جاتی ہے لیکن اپنے گردوپیش کو منور کر دیتی ہے۔ اسی طرح ہم بھی شمع کی مثال کو اپنا کر بزم گہِ عالم میں خود جلنے اور دیدۂ اغیار کو بینا کر دینے کا عہد کریں۔

"بانگ درا" میں "اسیری" کے زیرِ عنوان جو مختصر سی نظم ملتی ہے وہ علی برادران یعنی مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی کی قید سے رہائی کے موقعے پر اقبال نے ایک جلسے میں پڑھ کر سنائی تھی، یہ جلسہ خلافت کمیٹی کے زیر اہتمام منعقد کیا گیا تھا۔ مذکورہ نظم میں علی برادران کو ان کی بلندیٔ فطرت کی بناء پر خراج پیش کیا گیا ہے۔ انہیں بلند مقاصد کی خاطر اسیری کے عمل نے اور بھی محترم بنا دیا تھا، کیونکہ اُن کی اسیری ان کے اپنے کسی ذاتی مفاد کے نتیجے میں عمل میں نہیں لائی گئی تھی بلکہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے جذبے اور بے غرض عمل کی پاداش میں فرنگیوں نے انہیں قید کر دیا تھا۔ علی برادران کی اسیری کو اقبال نے قطرۂ نیساں سے مشابہہ کیا ہے جو صدف کی قید میں رہنے کے بعد ہی موتی بن کر بیش بہا ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جسے مشکِ اذفر کہا جاتا ہے وہ خون کی ایک بوند ہے اور یہ خون کی بوند جب آہو کی ناف میں قید ہو جاتی ہے تو ایک خاص قسم کا مشک بن جاتی ہے۔ اقبال کے نزدیک فطرت ہر شئے کی اس طرح تربیت نہیں کر سکتی۔ ایسے طائر کم ہی ہیں جنہیں قفس میں قید کر کے اُن کی عزت افزائی کی جاتی ہے۔ کوے اور چیل بھی تو پرندے ہیں لیکن کوئی انہیں قید نہیں کرتا۔ یہ سعادت تو صرف شاہین اور شاہباز کو ہی حاصل ہوتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر علی برادران کی فطرت میں اقبال باز اور شاہین کی خوبیوں کے پیش نظر انہیں خراج پیش کرتے ہیں۔

نظم "ہمایوں" اقبال نے اپنے محترم دوست جسٹس شاہ دین ہمایوں کے انتقال پر لکھ کر مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ جسٹس شاہ دین ہمایوں اور اقبال کے آپس میں

بڑے اچھے دوستانہ مراسم تھے۔ دونوں ایک دوسرے کی صحبتوں میں بیٹھ کر ایک دوسرے سے فیضیاب ہوتے۔ جسٹس مرحوم شاعر بھی تھے۔ اُن کے کلام کا مجموعہ ''جذبات ہمایوں'' ان کے انتقال کے بعد اُن کے صاحبزادے میاں بشیر احمد نے شائع کیا۔ شاعر اور ادیب ہونے کے ناطے اقبال کو مرحوم سے بڑی عقیدت تھی۔ اقبال مرحوم کی بڑی تعظیم کرتے تھے۔ بانگ درا کی نظم ''ہمایوں'' کے علاوہ بھی مرحوم کا ذکر اقبال نے اپنے اشعار میں جستہ جستہ کیا ہے۔ مثال کے طور پر اس غزل کے اشعار میں

لاؤں وہ تنکے کہاں سے آشیانے کے لئے　　بجلیاں بے تاب ہوں جس کے جلانے کے لئے
ترک کردی غزل خوانی مگر اقبال نے　　یہ غزل لکھی ہمایوں کو سنانے کے لئے

اقبال نے مذکورہ بالا نظم پر نظر ثانی کرتے وقت مقطع کو قلمزد کردیا تھا۔ نظم ''ہمایوں'' میں جسٹس شاہ دین ہمایوں کو مخاطب کر کے اُن کی خدمات کو سراہا گیا ہے جو وہ اپنی قوم کے لئے زندگی بھر انجام دیتے رہے۔ مرحوم کی ذات کو ملت اسلامیہ کے لئے باعث فخر قرار دیا گیا ہے۔ مرحوم اگر جسمانی اعتبار سے کمزور تھے لیکن اُن کی طبع ستارے کی مانند تھی۔ مرحوم کے پیکر ناتواں میں جو دل تھا۔ وہ کسی سے خائف نہیں تھا۔ انہیں موت کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ جس طرح رات کے بعد دن کا آنا ناگزیر ہے اسی طرح موت کے بعد دوبارہ زندگی کا تصور یقینی ہے، غافل موت کو زندگی کا اختتام سمجھتے ہیں لیکن موت زندگی کا خاتمہ نہیں بلکہ جسے اختتام زندگی سمجھا جاتا ہے، وہیں سے دراصل دائمی زندگی کی صبح کا طلوع ہوتا ہے۔

''نالۂ فراق'' علامہ محمد اقبال نے اپنے مشفق اور مربی استاد پروفیسر سر ٹامس آرنلڈ کی یاد میں ۱۹۰۴ء میں لکھی تھی۔ اُستاد کے انگلستان واپس جانے پر شاگرد نے اپنے قلبی تاثرات اور جذبات کا جس انداز میں اظہار کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آرنلڈ کی صحبت اقبال کے لئے کس قدر اہمیت کی حامل تھی۔ شاگرد کو جب استاد کی صحبت میسر تھی تو دُنیا کی ہر چیز بارونق دکھائی دیتی تھی۔ اب جو یہ صحبت میسر نہیں تو اقبال کی دنیا تیرہ وتار ہو کر رہ گئی ہے۔ نظم میں غم کے جذبات اور احساسات کے اظہار سے آرنلڈ کے ساتھ اقبال کے

غیر معمولی لگاؤ کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ استاد کے فراق میں جذبات کی وارفتگی کا یہ عالم ہے کہ ان کے رخصت ہو جانے کے بعد اقبال گوشۂ عزلت اختیار کر کے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئے ہیں ایسے میں وہ جنگل کا رخ کر لیتے ہیں، اقبال کے قلب و ذہن پر

رہے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو، والی کیفیت طاری ہے۔ اس کے بعد استاد کی قیام گاہ کی طرف چلے جاتے ہیں جہاں کے در و بام میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا ہے لیکن جب وہاں مکین کو نہیں پاتے، جس سے مکان کو شرف حاصل تھا۔ اقبال اپنے آپ کو ایک اجنبی کی طرح پاتے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ جب وہ اپنے استاد سے فیض یاب ہونے کے اہل ہو چکے تو دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ اگر وہ کچھ روز اور قیام کر لیتے تو اللہ جانے وہ کیا سے کیا ہو جاتے۔ اقبال استاد کی صحبت کو اپنے لئے ابرِ رحمت قرار دیتے ہیں جو اُن کے گلستان کی کلیوں کو کسی حد تک سیراب کر کے رخصت ہو گیا۔ اقبال اپنے استاد کو بحرِ علم کہہ کر ان سے استفسار کرتے ہیں کہ مجھے پیاسا چھوڑ کر آپ کہاں چلے گئے؟ آپ کی ذات میرے لئے افزائش علم کا باعث تھی۔ اور آپ ہی کے دم سے میرے دل میں حصول علم کا جذبہ موجزن تھا۔ آپ کے جانے سے میرا ذوقِ علمی سرد پڑ گیا ہے ؎

ذرہ میرے دل کا خورشید ہونے کو تھا　　آئینہ ٹوٹا ہوا عالم نما ہونے کو تھا
نخل مری آرزوؤں کا ہرا ہونے کو تھا　　آہ! کیا جانے کوئی میں کیا سے کیا ہونے کو تھا
ابرِ رحمت دامن از گلزار من برچید و رفت　　اند کے برغنچہ ہائے آرزو بارید و رفت

اقبال نے اپنے استاد کو کلیم ذروۂ سینائے طور کے لقب سے یاد کیا ہے۔ نظم کے آخری بند میں شاگرد اپنے استاد سے ملنے اور اُن سے گفتگو کرنے کی خاطر بیچ کے فاصلے کو طے کرنے اور انگلستان جانے کا ارادہ کرتا ہے حالانکہ استاد کی تصویر شاگرد کے پاس موجود ہے مگر تصویر دیکھنے کے بعد بھی شاگرد کا جی نہیں بھرتا۔ وہ تو اس سے ہم کلام ہونے کا شدید خواہاں ہے۔

"تاب گویائی نہیں رکھتا دہن تصویر کا　　خامشی کہتے ہیں جس کو ہے سخن تصویر کا"

نظم کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ایک عاشق اپنے معشوق کی دید کا بے صبری

کے ساتھ منتظر ہو، معشوق سامنے ہو تو دنیا کی ہر چیز بارونق نظر آتی ہے، اور فرقت کا عالم ہو تو عاشق کو دشت کی ویرانی ہی راس آجاتی ہے۔ پروفیسر آرنلڈ نے بھی اپنے شاگرد اقبال کے متعلق بڑی اچھی رائے دی ہے۔ ''ایسا شاگرد استاد کو محقق اور محقق کو محقق تر بنا دیتا ہے''۔

اقبال کا طبعی میلان شروع سے ہی فلسفے کی طرف تھا، جس کی تشکیل اور توسیع میں پروفیسر آرنلڈ نے ایک اہم کردار ادا کیا۔ پروفیسر آرنلڈ ایک متبحر عالم اور فلسفے کے استاد تھے۔ اقبال نے فلسفے کی باقاعدہ تعلیم انہیں سے حاصل کی۔ اُن کی شعری زندگی میں پروفیسر آرنلڈ کو اس وجہ سے بھی اہمیت حاصل ہے کہ اقبال کی زندگی میں ایک مرحلہ ایسا بھی آیا جب انہوں نے شعر گوئی ترک کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ مگر اقبال کے دوست سر عبدالقادر کے اصرار پر یہ فیصلہ پروفیسر آرنلڈ پر چھوڑ دیا گیا کہ اگر پروفیسر صاحب اقبال کے اس ارادے پر اپنی رضامندی کا اظہار کریں تو ویسا ہی ہوگا۔ بالآخر سر عبدالقادر کی رائے سے (جو اقبال کے ترک شعر گوئی کے ارادہ سے ہرگز متفق نہ تھے) پروفیسر آرنلڈ متفق ہو کر یہی طے پایا کہ اقبال کا ترک شعر گوئی کا ارادہ جائز نہیں۔ پروفیسر آرنلڈ کے ولایت رخصت ہو جانے کے بعد اقبال کے جذبات میں ایک طوفان بپا ہوا۔ مختلف علمی اداروں کے اہتمام سے اُن کے اعزاز میں کئی جلسے منعقد کیے گئے اور ان میں بہت سی نظمیں پڑھی گئیں۔ اقبال اس وقت ''نالۂ فراق'' لکھ چکے تھے۔ تاہم انہوں نے نظم میں اپنے وفور جذبات کے دردمندانہ اظہار کے پیش نظر اسے کسی عام جلسے میں پڑھنا مناسب نہیں سمجھا۔ اقبال کے بقول پروفیسر صاحب کی تشریف آوری کے بعد ''دلی تاثرات کی شدت اور بھی بڑھ گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نظم میں بہت سی تبدیلی ہوگئی''۔ نالۂ فراق شروع میں سر عبدالقادر کے پرچے ''مخزن'' ۱۹۰۴ء کے مئی کے شمارے میں شائع ہوئی تھی اور پہلے یہ نظم آٹھ بندوں پر مشتمل تھی مگر اقبال نے جب ''بانگ درا'' کو ترتیب دیا تو اس وقت اس میں سے تین بند حذف کیے گئے۔

اقبال نے انگریزی زبان و ادب کے عظیم شاعر اور ڈرامہ نویس پر ''بانگ درا'' میں

''شکسپیر'' کے عنوان سے دو بندوں پر مشتمل نظم میں شکسپیئر کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ بانگ درا کی کئی نظمیں انگریزی شعراء سے ماخوذ ہیں۔ مثلاً رخصت اے بزم جہاں، ایک پہاڑ اور گلہری، ہمدردی، عشق اور موت، پیام صبح وغیرہ وغیرہ۔ اسلوب احمد انصاری کے بقول اقبال کی معروف نظم ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' کی تخلیق کے وقت اُن کے تحت الشعور میں ولیم کوپر کی نظم On the receipt of his mother's picture ضرور رہی ہوگی۔ ولیم شکسپیئر کو خراج عقیدت پیش کرنے اور ان کے فن کی قدر سنجی کے لئے شکسپیئر کے وسیع اور بسیط مطالعے کی ضرورت ہے۔ شکسپیئر کی یہ خصوصیت ہے کہ انہوں نے انسانی فطرت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔ چنانچہ انہیں بجا طور پر فطرتِ انسانی کا نباض کہا گیا ہے۔ شکسپیئر کے یہاں فطرت انسانی کی مرقع کشی ہے اور انہوں نے انسانی فطرت کے مختلف پہلوؤں، ان کی گہرائیوں اور گتھیوں کی تشریح اپنے ڈراموں میں کی ہے۔ چنانچہ ان کے حسن کلام کو دل انسان کا آئینہ کہا گیا ہے۔ ؎

تجھ کو جب دیدۂ دیدار طلب نے ڈھونڈا — تابِ خورشید میں خورشید کو پنہاں دیکھا
چشم عالم سے تو ہستی رہی مستور تیری — اور عالم کو تری آنکھ نے عریاں دیکھا
حفظِ اسرار کا فطرت کو ہے سودا ایسا — راز داں پھر نہ کرے گی کوئی پیدا ایسا

اقبال نے اردو کے چند معروف شعراء کے علاوہ فارسی شعر و ادب کے بعض عظیم شعراء پر بھی نظمیں لکھ کر انہیں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ ''عرفی'' کے عنوان سے ''بانگ درا'' میں جو نظم ملتی ہے اس میں دراصل عرفی ہی کے ایک مشہور شعر پر تضمین کر کے عرفی کو اقبال نے خراج پیش کیا ہے۔ نظم کے پہلے دو اشعار میں عرفی کے کلام میں تخیل کی بلندی اور عاشقانہ سوز و گداز کی سراہنا کی گئی ہے۔ اقبال نے اپنے کلام میں کئی مقامات پر اس بات کی شکایت کی ہے کہ مسلمانوں میں وہ تڑپ اور جدوجہد کا جذبہ سرد پڑ گیا ہے جو ان کے اسلاف کی امتیازی شان تھی۔ چنانچہ زیر بحث نظم میں بھی اقبال عرفی کی تربت سے یہی شکایت کرتے ہیں کہ قوم خوابِ غفلت سے بیدار ہونا نہیں چاہتی۔ اسے میرا پیغام بیداری پسند نہیں اور وہ متوجہ

بھی کیسے ہوسکتی ہے جب کوئی قوم تاریکی کو اپنا مقصدِ حیات بنالے تو وہ روشنی کی طرف کیسے مائل ہوسکتی ہے۔ عرفی نے اقبال کی شکایت سن کر جواب دیا کہ اہل جہاں کا شکوہ مت کر بلکہ قوم کو گہری نیند میں سوتے ہوئے دیکھ کر تجھے اپنی لے کو اور تیز کرنا چاہیئے۔ اگر قوم شریعت کی پابندی کو گراں خیال کرتی ہے تو اسے اپنا پیغام زیادہ جوش وخروش کے ساتھ سنا۔

علامہ اقبال شبلی کی تصنیف ''شعرالعجم'' کو مسلمانوں پر اُن کا احسان قرار دیتے ہیں۔ حالی وشبلی دونوں مسلمانوں کے لئے گہری ہمدردی کا جذبہ رکھتے تھے۔ دونوں نے مسلمانوں کی فلاح وترقی اور سربلندی کے لئے انتھک کوششیں کیں۔ اقبال حالی وشبلی دونوں کے جونیئر معاصر تھے، تاہم اقبال نے شبلی کی وفات تک جو خدمات انجام دی تھیں، اُن کے پیش نظر شبلی اقبال کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ حالانکہ اقبال کو شبلی کی وفات کے بعد عالمگیر شہرت حاصل ہونے لگی۔ یہ اقبال کی خوش بختی تھی کہ انہیں شبلی اور حالی جیسے بزرگ اور امت مسلمہ کی دردمند شخصیتوں کی رہنمائی حاصل ہوئی۔ حالی نے قوم کو اپنی غلطیوں کا احساس دلایا، مسدس میں مسلمانوں کے انحطاط وزوال پر حالی ماتم کناں ہیں، اقبال کا یہ کارنامہ ہے کہ انہوں نے نہ صرف امت مسلمہ کے انحطاط وزوال پر ماتم کیا بلکہ اس کا سدباب کرنا بھی سکھایا۔ حالی اور شبلی دونوں بزرگ ہستیوں پر بانگِ درا کی نظم نہ صرف ان دو ممتاز ہستیوں کا مرثیہ ہے بلکہ اسے پوری مسلمان قوم کے مرثیے سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اقبال نظم میں دریافت کرتے ہیں کہ کیا سبب ہے کہ قوم پستی کی طرف جارہی ہے، مسلمان قوم جس سے تمام علوم وفنون اور سائنس نے ترقی کی اور جس کی بدولت تمام تہذیبیں اور علوم معرض وجود میں آئے، کی پریشانی کا سبب کیا ہے؟ اقبال یہاں پر تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہیں، ورنہ انہیں بخوبی معلوم ہے کہ یہ سب کچھ غفلت کے سبب ہوا ہے۔ قوم کے رہنما کی غفلت قوم کی تباہی کا باعث ہے چنانچہ اقبال اس تباہی سے محفوظ رہنے کے لئے ایسے اشخاص کی تلاش کرنے کے خواہاں ہیں جو اس کا سدباب کرسکیں۔ حالی اور شبلی جیسی دو بزرگ ہستیوں کے وجود سے قوم کی بہار تھی اور چونکہ یہ دونوں ہستیاں ملک عدم کو سدھار چکی

ہیں۔اس لئے بہار کی جگہ خزاں نے لی ہے۔ان کے انتقال سے قوم کا جو زیاں ہوا ہے اس کے سبب زندگی کے ہر شعبے میں ضعف پڑا ہے۔ حالؔی اور شبلی دونوں نے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کی سعی پیہم کی لیکن اب جب یہ دونوں نہیں رہے اس لئے کسی بھی شخص کو اس کا سدباب کرنے کی فرصت ہی نہیں۔ایسی حالت میں ذہن پریشان ہے اور اس سنجیدہ مسئلہ کا کوئی حل نظر نہیں آتا۔اقبال نے داغؔ پر نظم لکھتے ہوئے ضمناً حالؔی کی عظمت کا بھی ذکر کیا ہے۔اس وقت اگر کئی عظیم ہستیوں کے یکے بعد دیگرے انتقال کر جانے سے اقبال کو بڑا ہی دُکھ ہوا۔تاہم ابھی حالؔی کے وجود سے انہیں کئی توقعات وابستہ تھیں، مگر جب حالؔی بھی انتقال کر گئے تو اقبال کو گہرا صدمہ ہوا اور ادب اور شاعری کی دنیا تاریک نظر آنے لگی۔

سرسید احمد خان پر بھی ''بانگِ درا'' میں اقبال کی نظم ''سید کی لوحِ تربت'' درج ہے، جو اس شعر سے شروع ہوتی ہے ؎

اے کہ تیرا مرغ جان تار نفس میں ہے اسیر　　اے کہ تری روح کا طائر قفس میں ہے اسیر

اقبال اگرچہ سرسید کے بڑے معترف تھے، تاہم اُن کے نظریۂ تعلیم پر انہوں نے بڑی سخت تنقید کی ہے۔نظم ''مسلمان اور تعلیم جدید'' کے یہ اشعار ملاحظہ کریں ؎

رہبر کے ایما سے ہوا تعلیم کا سودا مجھے
واجب ہے صحرا گرد پر تعمیلِ فرمانِ خضر
لیکن نگاہ نکتہ بیں دیکھے زبوں بختی مری
"رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد"

حضورؐ کا نظریۂ شعر اور

علامہ اقبال اسرارِ خودی کی روشنی میں

کفار مکّہ نبیؐ برحق کی نبوت کا اعتراف نہ کرتے ہوئے طرح طرح کی بہتان تراشیوں سے کام لیتے تھے۔ کبھی آپؐ کو کاہن اور شاعر قرار دیکر آپؐ کی تعلیم و تلقین کو باتوں میں اڑا دینے کی کوشش کرتے، کبھی یہ کہتے کہ آپؐ نے ہمیں کوئی ایسی نشانی نہیں دکھائی جس سے آپؐ کے نبی ہونے کا ہم کو یقین آئے۔ اس طرح کفار مکّہ اپنی ہٹ دھرمی پر کاربند تھے اور اس ہٹ دھرمی کی نئی نئی صورتیں اختیار کرتے بالکل نہ تھکتے۔ کفار مکّہ کی یہی ہٹ دھرمی رسول اللہؐ کے لئے سوہان روح بنی ہوئی تھی۔ انہیں حالات میں سورۂ شعراء کا نزول ہوا اور اس سورۃ کی ابتدا ہی میں اللہ تعالیٰ رسول اللہؐ سے مخاطب ہیں کہ "اے محمد! شاید تم اس غم میں اپنی جان کھودو گے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔ ہم چاہیں تو آسمان سے ایسی نشانی نازل کر سکتے ہیں کہ ان کی گردنیں اس کے آگے جھک جائیں"۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے کاہن اور شاعر کے فریب کو توڑ دیا اور کہانت تو درکنار آپؐ کی ذاتِ اقدس سے شعر کی بھی نفی کر دی اور کاہنوں اور شاعروں کی شدید تنقید کر دی۔ قرآن میں کاہنوں کی نسبت فرمایا گیا ہے کہ یہ کاہن تو باتیں اڑا لیتے ہیں، ادھر اُدھر کی باتیں سن کر یا اپنی معلومات پر قیاس آرائی سے کام لے کر پیشن گوئی کرتے ہیں اور غیب کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اور ان میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں اور شاعروں کو گمراہوں کا پیشوا کہہ کر فرمایا کہ شاعروں کی پیروی تو گمراہ لوگ ہی کرتے ہیں۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ وہ

ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں اور جو کچھ وہ کہتے ہیں کرتے (کبھی) نہیں۔ مگر وہ لوگ جو ایمان لائے، نیکوکار رہے اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہے اور بدلہ لیتے ہیں تو صرف ظلم سہنے کے بعد اور ظلم کرنے والے بہت جلد جان لیں گے کہ وہ کس کروٹ اٹھتے ہیں۔

(سورۃ شعراء، آیات ۲۲۴۔۲۲۷)

کاہن قیاس آرائیوں سے کام لیتے اور انہیں احکام نبوت سے دور کا بھی علاقہ نہ ہوتا۔ اور نہ ہی شاعرانہ موہومات اور واہی تباہی کی باتیں حقائق اور مکارمِ اخلاق کا مقابلہ کرسکتی ہیں۔ لیکن حضورؐ کے مخالفین کا یہ خیال تھا کہ اس نوع کی حیرت انگیز باتیں کرنے والا یا تو کاہن ہوسکتا ہے یا شاعر یا ساحر۔ یعنی مخالفین آپؐ کی نبوت پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ اس لئے اتمام حجت کے لئے انہیں ایک چیلنج دیا گیا کہ اگر تمہیں شبہ ہے اور تم قرآن کو اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں سمجھتے تو ایسی کوئی سورت یا اس جیسی کوئی عبارت تم بھی بنالاؤ لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی چیلنج کے طور پر کہی گئی کہ تم سب ملک کر بھی اس کوشش میں کامیاب نہ ہو پاؤ گے۔ چنانچہ فصاحت کا دعویٰ کرنے والے تمام لوگ اپنی اپنی کوششوں میں ناکام ثابت ہوئے اور جب ان کلمات میں فصاحت اور بلاغت کو اپنی انتہا پر پایا ۔ انا اعطینٰك الکوثر، فصلِ لربك والنحر، انَّ شانئك هوالابتر۔ تو انہیں اس بات کا اعتراف کرنا ہی پڑا۔ ماهذا قول البشر۔ یعنی یہ آدمی کا کلام نہیں ہے۔ نتیجے کے طور پر کعبے کے دروازے سے معجزات فصاحت سبعہ معلقات اتار لئے گئے اور شعرائے عرب نے رسول اللہؐ کے سامنے ہتھیار ڈال دئے۔

کہانت کا دارومدار چونکہ قیاس آرائیوں پر تھا۔ اور ان میں سے اکثر قیاس آرائیاں غلط ثابت ہوتی تھیں، اور چونکہ اس قسم کی اوہام پرستی نے قوتِ عمل پر سخت مہلک اثرات ثبت کئے۔ چنانچہ کاہنوں کو ناقابل اعتبار اور ان میں سے اکثر کی تکذیب کی گئی۔ لیکن شاعری چونکہ مکمل طور سے بیکار چیز نہ تھی بلکہ اس فن کا غلط اور منفی استعمال کیا جاتا تھا، اور شعرائے جاہلیت ایک دوسرے کو آپس میں مشتعل کرنے اور برسرپیکار کرنے میں اپنا تمام

زورِ کلام صرف کرتے رہتے تھے اور خود کسی مسلک کے پابند نہ ہوتے تھے۔ اس لئے ان کی اس بے عمل زندگی اور لا اُبالی پن کے مقابلے میں ایک راہ عمل سجھا کر بتا دیا گیا کہ جو اس راہ پر چلیں گے۔ اچھے شاعر نہیں سمجھے جائیں گے۔

قرآن پاک نوع انسانی کو فرد اور معاشرے کے وجود کے ممکنات خیر کی نمود و تکمیل کے اصول عطا کرنے کے لئے نازل کیا گیا ہے۔ قرآن انسان کو اس کے اصلی شرف یا منصب پر فائز کرنے کا خواہاں ہے۔ ایک احسن اور پائندہ معاشرت اور معیشت کی اساس فراہم کرتا ہے اور پھر حضورؐ ترجمانِ حقیقت تھے، شاعر نہ تھے اور نہ شاعری آپؐ کے لئے زیبا تھی۔ آپ کا منصب تو تعلیم قرآن اور تبلیغ احکام دین تھا۔ پیغمبرانہ صداقت اور شعری تخیلات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

قرآن کے بعد جب ہم احادیث کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کو اگرچہ شعر کا علم نہیں دیا گیا، اور یہ علم آپؐ کے لائق نہ تھا لیکن پھر بھی شاعرانہ کلام سے آپ کی دل چسپی اور علمیت کا ضرور علم ہوتا ہے۔ آپؐ شعر سماعت فرماتے تھے، شعر پر تنقید فرماتے تھے شعراء کی حوصلہ افزائی کے لئے انہیں مناسب داد اور انعام دیتے تھے۔ شعراء آپؐ کی خدمت میں جمع ہو کر مشاعرے کرتے تھے اور بعض اوقات آپؐ کی زبانِ مبارک سے شعر سے مشابہہ کلمات ادا ہوتے تھے۔ آپؐ نے شاعری کے فرد اور معاشرے کی تعمیر و ترقی میں بھرپور کردار ادا کرنے کی پرزور حمایت کی ہے۔ آپؐ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ شاعر اور شاعری کیسی نہیں ہونی چاہیے۔ آپؐ نے پوری شدت کے ساتھ معاصر شعراء کی Fulminations (تکذیب) کو مسترد کیا ہے۔ لیکن اس کے پہلو بہ پہلو مستثنیات کو قابل تحسین بھی قرار دیا ہے۔ ایک مرتبہ جب آپؐ کے سامنے شاعری کا تذکرہ کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا۔ شاعری اظہار کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ خوب ہونے کی صورت میں یہ قابل تحسین ہے اور زشت ہونے کی صورت میں اسے مسترد کیا جانا چاہیے۔ حضورؐ نے بری شاعری کی خوب مذمت کی ہے۔ آپؐ نے اُن شعراء کی بھی خوب خبر لی ہے جو انسان کے نفسانی جذبات کو برانگیختہ کر کے اُسے زندگی کا کوئی اہم اور سنجیدہ کام کرنے کی فرصت ہی نہیں دیتے۔ ایک مرتبہ مکّے کے گردونواح میں جب ایک شخص نے آپؐ کے سامنے

شاعری سنانا شروع کی تو آپؐ نے برافروختہ ہوکر فرمایا کہ اس شیطان کا گریباں پکڑلو۔ واقعتاً کسی کی آنتوں کو شاعری سے بھر دینے سے اُسے پیپ سے بھر دینا بہتر ہے۔ لیکن اس سے یہ مراد نہ لی جائے کہ حضورؐ نے تمام قسم کی شاعری، خواہ وہ اچھی ہو خواہ بری، کو برا بھلا کہہ کر اس کی مذمت کی ہے۔ آپؐ نے صرف اس قسم کی شاعری کی مذمت کی ہے جو انسان کے نفسانی جذبات کو مشتعل کر کے اسے عبادتِ الٰہی اور استغراق کے لئے کوئی موقع ہی فراہم نہیں کرتی۔ حضورؐ نے اچھی شاعری کی خوب سراہنا کی ہے۔ مثال کے طور پر جاہلیہ کے شعراء میں سے لابدین رابعہ انصاریہ کی شاعری کو اس کی اخلاقی قوت اور خیر کی اپیل کے لئے مستحسن قرار دیا ہے۔ آپؐ اکثر موصوف کے اشعار کا حوالہ دیتے۔ جب ایک مرتبہ لابد کا ایک شعر آپؐ کی موجودگی میں سنایا گیا تو آپؐ نے فرمایا کہ جس طرح قرآن کے لئے سجدہ واجب ہے عین اُسی طرح اس شعر کے لئے بھی سجدہ واجب ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ لابد مشرف بہ اسلام ہوئے تھے اور وہ یہ کہنے میں بڑی خوشی محسوس کرتے تھے کہ

"اللہ تبارک تعالیٰ لایق شکر وثناء ہے کہ یقین نے اُس وقت تک سبقت نہ لی جب تک نہ میں نے اسلام کا لبادہ اوڑھ لیا۔"

ایک مرتبہ حضور اکرمؐ سے کعبؓ نے عرض کی کہ یارسول اللہؐ، اللہ نے شعر کی مذمت کی ہے۔ آپ کیا فرماتے ہیں؟ تو جناب حضور اکرمؐ نے فرمایا جو شعراء تائید اسلام اور ہجو کفار میں شعر کہتے ہیں۔ وہ گویا تلوار سے جہاد کرنے والے مومن کی طرح زبان سے جہاد کرتے ہیں۔ اس سے یہ مراد ہے کہ حضورؐ نے شعر یا شاعری کا ایک معیار قائم فرمایا ہے۔ جس کی رُو سے اسلام کی حمایت میں اور کفار کی ہجو میں کہے جانے والے شعر مستحسن ہیں۔ عہدِ رسالت کے نعت گو شاعر حسان بن ثابت کی نسبت رسول اللہؐ نے فرمایا کہ اللہ روح القدس کے ذریعے حسان کی مدد کرتا ہے۔ بخاری کی ایک حدیث کے مطابق واقعی بعض شعر سراسر حکمت ہوتے ہیں۔ شاعر تلمیذ الرحمٰن ہوتے ہیں۔ عرش معلّٰی کے نیچے اللہ کے خزانے ہیں جن کی کنجیاں شعراء کی زبانیں ہیں۔ اپنے بچوں کو شعر سکھاؤ۔ اس سے شجاعت پیدا ہوتی ہے۔ صحابہ نے ایک مرتبہ حضورؐ سے شعر گوئی کے متعلق دریافت کیا کہ شعر کہنا اچھا ہے یا برا۔ تو

حضورؐ نے فرمایا۔ شعر بھی عام کلام کی طرح دو قسم کے ہوتے ہیں۔ اچھی قسم کے شعرا اچھے ہوتے ہیں اور بُری قسم کے برے۔ امرؤالقیس جو اسلام سے پہلے دورِ جاہلیت کا ایک عظیم عرب شاعر گذرا ہے، کی نسبت حضورؐ نے فرمایا ہے۔ الشعرا شعرا و قائدھم الی النار۔ یعنی وہ شاعروں کا سردار ہے لیکن جہنم کی راہ میں وہی اُن کا رہبر ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ''امرؤالقیس کی شاعری میں شراب ارغوانی کے دور، حسن و عشق کی ہوش ربا داستانوں اور جاں گداز جذبوں، آندھیوں سے اُڑی ہوئی پرانی بستیوں کے کھنڈروں کے مرثیوں، سنسان ریتلے ویرانوں کے دل ہلا دینے والے منظروں کی تصویریں نظر آتی ہیں، جو قوتِ ارادی کو جنبش میں لانے کے بجائے اپنے سامعین کے تخیل پر جادو کے ڈورے ڈال کر ان میں بجائے ہوشیاری کے بے خودی کی کیفیت پیدا کرتی ہیں''۔[1]

اسی طرح ایک دوسرے موقعے پر عبس کے قبیلے کے ایک شاعر عنترہ کا ایک شعر۔

ولقد ابیت علی الطویٰ داظنہ حتی انال بہ کریم السماکل

سن کر آپؐ نے اس سے ملنے کی خواہش کا اظہار فرمایا۔ عنترہ کے جس شعر سے حضورؐ متاثر ہوئے تھے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ میں نے بہت سی راتیں محنت و مشقت میں بسر کیں تا کہ اکلِ حلال کے قابل ہو سکوں۔ حضورؐ نے عنترہ کا یہ شعر سن کر فرطِ مسرت محسوس کی اور اپنے ساتھیوں سے فرمایا۔ ایک عرب کی ستائش نے ہرگز میرے اندر یہ خواہش پیدا نہ کی کہ میں اُسے دیکھ لوں البتہ اس شعر کے خالق سے میں ملنے کا ضرور خواہشمند ہوں۔

علامہ محمد اقبال کو سرورِ دو عالمؐ کی ذات اقدس سے والہانہ عشق تھا۔ آپؐ کی ذاتِ اقدس سے والہانہ عشق ایک مسلمان کے ایمان کی اساس ہے۔ کیونکہ خود حضورؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ تم میں سے کوئی ایمان میں اس وقت تک پختہ نہیں ہوتا جب تک کہ میری محبت اس کے دل میں اس کے باپ، بیٹے اور تمام انسانوں سے بڑھ کر راسخ نہ ہو جائے۔ (متفق علیہ) اور قرآن پاک کے سورہ نساء کی رُو سے اطاعتِ رسولؐ کو اطاعتِ الٰہی کا ہم معنی و

۱۔ محمد عبداللہ قریشی، اقبال معاصرین کی نظر میں، ص ۱۴۔

مترادف اور محبت الٰہی پر منحصر قرار دیا گیا۔ من یطع الرسول فقد اطاع اللہ۔ یعنی جو رسولؐ کی اطاعت کرتا ہے وہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے۔ اسی طرح سورۂ آلِ عمران کی آیت نمبر ۳۱ میں درج ہے۔

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ و یغفر لکم زنوبکم

"فرما دیجئے کہ اے لوگو! اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو (ایسی صورت میں) خدا تم سے محبت فرمانے لگے گا اور تمہارے سارے گناہ بخش دے گا"۔

علامہ اقبال نے سیرت رسولؐ کا بغور مطالعہ کیا تھا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ سرور دو عالمؐ کی ذات بابرکات تمام ظاہری و باطنی کمالات کا جامع ہے اور تمام مظاہر حقیقت و مجاز کا سرچشمہ۔ چنانچہ اقبال اسی ذات بابرکات کے نقشِ قدم پر چلنے کا بصیرت افروز اور روح پرور پیغام اُمت مسلمہ کو زندگی بھر دیتے رہے۔ ان کے نزدیک اتباع رسولؐ مسلمان کی سرخروئی کا ضامن ہے۔ اقبال اس راز سے بخوبی آگاہ ہیں کہ امت مسلمہ کی فلاح و نجات کا واحد ذریعہ اطاعت رسولؐ ہے۔ چنانچہ وہ مسلمان کی سرشت کو ایک موتی کی مانند قرار دیتے ہیں جسے بحرِ رسولؐ سے آب و تاب حاصل ہوتی ہے۔

اقبال کا کلام سیرت النبیؐ کی منظوم تفسیر ہے۔ انہیں یہ امتیاز حاصل ہے کہ انہوں نے ایک دانشور ہونے کے پہلو بہ پہلو ایک حقیقی عاشقِ رسولؐ کی طرح امت مسلمہ کو رہ رہ کر اتباع رسول کرنے کی ہدایت کی ہے۔ وہ مسلمان کو زندگی کے ہر شعبے میں آپؐ کے نقش قدم پر چلنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ظاہر ہے اقبال حضور پاکؐ کی سیرت کے ہر پہلو سے گہرے طور پر متاثر ہیں۔ یہاں تک اُن کے نظریۂ شعر پر بھی آپؐ کے نظریہ شعر کی گہری چھاپ معلوم ہوتی ہے۔ اس بات کا ثبوت اُن کے بیاض (Stray Reflections) جسے انہوں نے ۲۷، اپریل ۱۹۱۰ء کو لکھنا شروع کیا تھا، کے ایک عنوان "Our Prophet's Criticism of Contemporary Arabian Poetry" سے فراہم ہوتا ہے۔ اقبال کے نزدیک تاریخ نے پیغمبر اسلام محمد رسول اللہؐ کے معاصر عرب شاعری پر چند تنقیدی خیالات کو

محفوظ کرلیا ہے جن میں سے دو طرح کی تنقیدیں ہندوستانی مسلمانوں کے حق میں بہت مفید یا سودمند ہیں۔ ایک قسم کی تنقید کی رو سے اس بات کا علم ضرور ہوتا ہے کہ شاعری کیسی نہیں ہونی چاہیے اور دوسری قسم کی تنقید یہ بتاتی ہے کہ شاعری کیسی ہونی چاہیے۔ پہلی قسم کی تنقید کے ثبوت میں وہ حضور پاکؐ کی وہ حدیث رقم کرتے ہیں جس میں آپؐ نے دورِ جاہلیت کے مشہور عرب شاعر امرالقیس کے متعلق اشعر الشعرا و قایدھم الی النار فرمایا ہے اور تنقید کی دوسری قسم کے ثبوت میں قبیلۂ عبس کے شاعر عنترہ کے شعر ؎

ولقد ابیت علی الطویٰ داظنہ حتی انال بہ کریم السماکل

کو سماعت فرما کر ان سے ملنے کی خواہش کا اظہار فرمایا تھا۔ اقبال اس بات کو قابل غور سمجھتے ہیں کہ حضورؐ نے عنترہ کو جو شرف یا اعزاز بخشا، اس کے پس پشت کیا حکمت ہے؟ کیا راز ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ عنترہ کا شعر نہایت ہی صحت بخش اور مفید ہے اور شاعر نے اکلِ حلال کی تکلیف کو مثالی حیثیت عطا کی ہے۔ حضورؐ کے اس شعر کو مستحسن قرار دینے سے اصولِ فن کے بیش بہا ہونے کی نشاندہی ہوتی ہے۔ فن زندگی کے تابع ہے اور ہر شئے کی قدر و قیمت کا تعین اس کی صحت بخش قوت کے حوالے سے کیا جائے۔ اقبال کے نزدیک عظیم ترین فن وہ ہے جو ہمیں زندگی کی آزمایشوں کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی قوت عطا کرے۔ جو فن انسان پر بے خودی کی کیفیت طاری کر کے اسے گردوپیش کی حقیقت سے بیگانہ یا غافل کردے، انسان کے حق میں انحطاط اور موت کا پیغام ہے۔ اقبال کے نزدیک فن افیونی کیفیت سے پاک ہو۔ اس طرح اقبال فن برائے فن کے اصول کو انحطاط یا تنزل کی پیداوار سمجھتے ہیں۔ پس حضورؐ کے عنترہ کے شعر کی تحسین تمام تر فنون یا فن کی مناسب قدر سنجی کا ابدی اصول متعین کرتی ہے۔

شعر یا شاعری کے متعلق اقبال کے نظریئے میں بڑی سنجیدگی اور مقصدیت کارفرما ہے۔ اقبال فن برائے فن کے نظریئے کے شدید مخالف ہیں۔ وہ اس نظریئے کو فریب نظر، ملمع کاری اور حرف سازی قرار دیتے ہوئے اسے ایک ایسے خوش رنگ پھول سے تعبیر

کرتے ہیں جس کا ذائقہ نہایت کڑوا اور جس کے اثرات نہایت مہلک ہوں۔ اُن کے نزدیک فن برائے فن کا نظریہ ایک ایسا جسم ہے جو روح سے خالی ہو۔ یہ ایک ایسی تصویر ہے جو بے جان ہے جو متحرک ہونے پر بھی عالم تصاویر سے گزر کر عالم اجسام میں قدم نہیں رکھ سکتی۔ اقبال کے فلسفے کے مطابق فن مقصود بالذّات نہیں۔ مقصود بالغرض ہے یعنی اُسے زندگی کا خادم ہونا چاہیے۔ ذوقِ حیات سے رُوگردانی کرنے والے فن کار کی قوم بہت جلد اجل آشنا ہوتی ہے۔ اقبال شعر کو تفنن طبع یا دل کی بھڑاس نکالنے کا وسیلہ نہیں سمجھتے، اُن کے نزدیک ایک ایسا فنکار جو لوگوں کے دلوں کو لبھانے کی خاطر زشت کو خوب کر کے دکھاتا ہے،

''اس کے بوسے گلوں سے اُن کی تازگی لے لیتے ہیں، اس کے نغمے بلبل کے دل سے ذوق پرواز چھین لیتے ہیں۔ یوں وہ اپنے فن کی قیمت وصول کرتا ہے اور ہماری زندگی اس کے فن کا نذرانہ بن جاتی ہے۔ جب ہم اُس کے نغموں کی محویت میں حقایق حیات سے روگرداں ہو کر خود فراموشی اختیار کر لیتے ہیں تو ہستی کی تمنا ہمارے دل سے جاتی رہتی ہے۔ ایسا آرٹ فکر کی کشتی نازک کو رواں تو کر دیتا ہے لیکن عمل سے آدمی کو بیگانہ بنا دینا بھی اُسی کا کام ہے۔''[1]

اقبال کے نظریۂ شعر کو سمجھنے کے لئے ان کے پہلے فارسی مجموعۂ کلام اسرارِ خودی کے ایک عنوان ''درحقیقت شعر و اصلاح ادبیات اسلامیہ'' کا مطالعہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس عنوان کے تحت شعر کی حقیقت بیان کر کے اسلامی ادبیات کی اصلاح کا ذکر کیا گیا ہے تاکہ شعر و ادب کو عجمیت سے نکال کر اس کا رخ عرب کی طرف کیا جائے اور یہ زندگی اور عمل کی صحیح معنوں میں ترجمانی کر سکے۔ اقبال ادب میں فکر صالح پیدا کرنے کے شدید خواہاں ہیں اور اس کے لئے سوئے عرب مراجعت کرنے کو لازم قرار دیتے ہیں۔ مذکورہ عنوان کی ابتداء ہی میں آرزو کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ داغِ آرزو ہی ہے جو انسان کو گرم رو رکھتا ہے۔ چراغِ آرزو ہی کی بدولت خاک، آتش میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ آرزو کے باعث زندگی

۱۔ گوہر نوشاہی (مرتب)، مطالعۂ اقبال، ص ۲۷۴۔۲۷۵

گرم خیز اور تیز گام ہے۔ اقبال زندگی کو تسخیر کا مضمون اور آرزو کو تسخیر کے افسوں سے تعبیر کرتے ہیں۔ زندگی صیاد ہے جو آرزوؤں کا جال بچھا کر اپنی تکمیل کی خواہاں ہے۔ دل میں ہر لحظہ پیدا ہونے والی تمنائیں زندگی میں زیر و بم پیدا کرنے کا ایک بہانہ ہیں۔ دنیا کی وہ ہر چیز جو حسن و زیبائی کا مرقع ہے، ہماری آرزوؤں کی محرک ہے۔ اقبال نے شعر کی حقیقت کو واضح کرتے ہوئے انسان کی زندگی میں آرزو کو بڑی اہمیت دی ہے۔ اسی آرزو کو اقبال مدعا یا مقصد آفرینی سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ صوفیا بالعموم خواہشات کو ترک کرنے کی تلقین کرتے رہے ہیں لیکن اقبال نے ترکِ خواہشات کو مستحسن نہ سمجھ کر انسان یا شاعر کی زندگی کو بامقصد یا معنی خیز بنانے کی خاطر آرزو پر زور دیا ہے۔ زیرِ بحث عنوان کے ابتدائی بند میں آرزو اور اس کی اہمیت واضح کرنے کے بعد اقبال حقیقی شاعر کے اعلیٰ مقام و منصب کا ذکر کرتے ہیں۔ اقبال سینۂ شاعر کو تجلی زارِ حسن سے تعبیر کرتے ہیں۔ شاعر کی نگاہ خوب کو خوب تر میں بدل دینے کی ملکہ رکھتی ہے۔ وہ خلاقِ حسن ہے۔ اس کے آب و گل میں بحر و بر پنہاں ہیں۔ اس کے دل میں سینکڑوں نئے جہاں پوشیدہ ہیں۔ اس کی فکر ماہ و انجم کی ہم نشین ہے۔ شاعر کے بلند مقام و منصب کا ذکر کرنے کے بعد اقبال ایسے شاعر کو قابلِ رحم سمجھتے ہیں جو ذوقِ حیات سے عاری ہو۔ جس شاعر کے نغمے انسان کے دل سے ثبات لوٹ لیں اور جس کے طلسم سے اسے موت پر حیات کا گماں ہو، اقبال ایسے شاعر کو مذموم قرار دیتے ہیں، جس شاعر کے کلام سے انسان کے دل سے زیست کی خواہش جدا ہو جائے، جو ہر زیاں کو سود کی شکل میں پیش کرے جو ہر مذموم کو محمود بنائے۔ جو فکر و اندیشہ کے دریا میں انسان کو گرا کر اُسے عمل سے بیگانہ کر دے، اُسے حذر کرنا چاہیے، کہتے ہیں ؎

خستۂ ما از کلامش خستہ تر انجمن از دورِ جامش خستہ تر
جوی برقے نیست در نیسان اُو یک سراب رنگ و بو بستان او
حسن اورا باصداقت کار نیست دریمش جز گو ہر تقدار نیست
خواب را خوشتر زبیداری شمرد آتشِ ما از تفسہایش فسرد
قلب مسموم از سرودِ بلبلش خفتہ ماری زیر انبارِ گلش

از خم و مینا و جامش الحذر از مئے آئینہ فامش الحذر

دوسرے بند میں اس قوم کی بدنصیبی کا ماتم کیا گیا ہے جس کے شعراء قوم کی زندگی کے حقائق سے فرار کی تلقین کرتے ہیں، اور ایسے شاعر کے معائب بھی واضح کر دئے ہیں۔ تیسرے بند میں مسلمانوں پر جھوٹے شاعروں کے زہریلے اور تباہ کن اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ چوتھے اور آخری بند میں اقبال نے شعراء کو روح پرور پیغام دیا ہے اور سخن کو پرکھنے کی خاطر زندگی کی کسوٹی کو لازم قرار دیا ہے۔ اقبال کے نزدیک جس شاعر کا کلام زندگی کی ضروریات کا ساتھ دے اور اُس سے ہمیں زندگی کی آزمائشوں سے برسرِ پیکار ہونے کی دعوت ملے، وہ فن واقعی قابلِ قدر ہے اور جس شاعر کا کلام زندگی سے ستیز کی دعوت نہ دے بلکہ زندگی سے فرار کی تعلیم دے اقبال ایسے شاعر کو مذموم قرار دیکر یکسر مسترد کر دیتے ہیں۔ اقبال ایسے فکر کی تلاش کرنے کی تاکید کرتے ہیں جو عمل کی راہبر ہو۔ شعراء سے ادب میں فکرِ صالح پیدا کرنے کے لئے سوئے عرب مراجعت کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ ہم نے عجم کے چمن زاروں سے خوب گل چینی کی اور نو بہار ہند و ایران بھی خوب دیکھ چکے۔ اب شعر و ادب ہم سے گرمیِ صحرا اور بادۂ دیرینہ فرما کا مزہ چکھنے کا متقاضی ہے۔ شعر و ادب اب ہم سے کرپاس کی سختی کا خوگر ہے، ریگِ سوزاں پر چلنے اور زمزم کے چشمے میں غوطہ زن ہونے کا تقاضہ کر رہا ہے۔ اقبال شاعر سے اپنے دل و دماغ کو بلند و بالا نصب العین کا مرکز بنانے کی ہدایت کرتے ہیں، جہاں سے ایسے افکار و خیالات قارئین تک پہنچیں جو اُن کے اخلاق و کردار میں رفعت پیدا کر سکیں۔ شاعر کو اعلیٰ اخلاقی اقدار کا پاسبان ہونا چاہیے۔ اُسے عظیم الشان اسلامی روایات کا امین ہونے کا بخوبی احساس ہو۔ اس لئے کارِ زارِ حیات سے برسرِ پیکار ہو کر اُسے بلندیٔ افکار و کردار کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔

اے ھما از یمن دامت ارجمند آشیانی ساز برکوہِ بلند
آشیانی برق و تند در بری از کنامِ جرہ بازان برتری
تا شوی در خورد پیکارِ حیات جسم و جانت سوزد از تارِ حیات

مثنوی اسرارِ خودی پر ایک نظر

مثنوی اسرارِ خودی کو موضوعِ بحث بنانے سے پیشتر مذکورہ مثنوی کے حوالے سے دو اساسی نکتوں کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے۔ اول یہ کہ اردو سے فارسی کی طرف اقبال کے میلان یا diversion کے اسباب اور دوم یہ کہ اس مثنوی کے لئے بالخصوص خودی ہی کا موضوع منتخب کرنے کا سبب۔ جہاں تک پہلے نکتہ کا تعلق ہے، اردو زبان میں بانگِ درا، بالِ جبریل اور ضربِ کلیم جیسی وقیع تصانیف کے باوجود اقبال کو دقیق خیالات کے اظہار اور وسعت بیان کی خاطر اردو کے تنگنائے سے نکل کر فارسی کو اختیار کرنا پڑا۔ اقبال کے شعری مذاق میں اس تغیر کے رونما یا وقوع پذیر ہونے کے پس پشت کئی عوامل کارفرما بتائے جاتے ہیں۔ اس کی سب سے پہلی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ تصوف پر کتاب لکھنے کے لئے اقبال نے جن کتابوں کا مطالعہ کیا اور علم فلسفہ کے متعلق جیسے جیسے اُن کے علم میں وسعت اور گہرائی آتی گئی، اُسی قدر انہیں اندازہ ہوا کہ اردو کے مقابلے میں فارسی کا سرمایہ کہیں زیادہ ہے۔ ''اور فارسی میں کئی فقرے اور جملے سانچے میں ڈھلے ہوئے ایسے ملتے ہیں جن کے مطابق اردو میں فقرے ڈھالنے آسان نہیں''۔[1] ظاہر ہے یہ تغیر کوئی وقتی یا اضطراری تغیر نہ تھا بلکہ اسے اقبال کے تخلیقی سفر میں ایک سنجیدہ اور معنی خیز تغیر سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اسرارِ خودی سے لیکر ارمغانِ حجاز تک اقبال کا تمام تر شعری سفر فارسی زبان ہی میں جاری رہا۔ ہاں البتہ اس سفر کے دوران وہ اردو میں بھی لکھتے رہے تاہم ان کا طبعی اور ذہنی میلان اب زیادہ تر فارسی ہی کی طرف رہا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اب فارسی اُن کے رگ و پے میں سرائیت

۱۔ کلیاتِ اقبال۔ دیباچہ از شیخ عبدالقادر بیرسٹرایٹ لا سابق مدیر مخزن، ص ۱۶۔

کر چکی تھی اور ان کے ذہن وقلب کا جز ولاینفک بن چکی تھی۔ دوسری بات یہ کہ اسرار خودی میں خالصتاً خودی کا موضوع منتخب کرنے کے پس پشت بھی کئی عوامل کارفرما ہیں، اقبال اس مثنوی کے ذریعے مسلمانوں کے ذہنوں میں عرصۂ دراز سے راسخ ہوئے غیر اسلامی عقائد اور تصورات کی جگہ اس حقیقی اسلام کو، جسے رسول مقبولؐ نے پیش کیا تھا بٹھانا چاہتے تھے کیونکہ ہندوستان کے مسلمان اسلام کی حقیقی تصویر کو بہت حد تک فراموش کر چکے تھے اور عجمی اسلام ہی کو سب کچھ سمجھ رکھا تھا۔ مسلمانوں کے ذہنوں میں عجمی تصوف یا غیر اسلامی تصوف کے نتیجے میں نفیِ خودی کا تصور کافی پختہ ہو چکا تھا، دوسری طرف ہندومت اور بدھ مت کی رو سے اپنی خودی کو مٹا دینے والا منش خدا کا ہم ذات ہو جاتا یا خود خدا بن جاتا ہے۔ اسی طرح مسلمانوں میں قناعت، توکل، تسلیم و رضا کے تصورات بھی اقبال کے نزدیک غیر اسلامی ہو کر رہ گئے تھے۔ نفس کشی کے لئے ضروری سمجھا جاتا تھا کہ انسان آرزوؤں اور خواہشات کو ترک کر دے اور ترک آرزو یا ترکِ خواہش سے قربِ الٰہی حاصل ہونے کا تصور یا عقیدہ عام ہو چکا تھا۔ مسلمانوں میں اس نوع کے غیر اسلامی تصورات کے ردِعمل میں اقبال نے مثنوی اسرارِ خودی کے دیباچے میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کے صوفیانہ افکار پر سخت تنقید کر کے انہیں مسلمانوں کے لئے اس لئے مضرت رساں قرار دیا کیونکہ وہ مسلمانوں کو بے عملی کی تعلیم دیتے ہیں اور بے عملی کی تعلیم قرآنی تعلیم کے بالکل منافی ہے اسی طرح فنا اور بقا کے تصورات بھی اسلامی تصوف کے مطابق نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ بعض اکابر صوفیائے اسلام نے فنا اور بقا کے تصورات کی تعریف قرآن کے تناظر میں کی ہے لیکن ایسے ہندی اور ایرانی صوفیاء کی بھی کمی نہیں جنہوں نے مسئلہ فنا کی تفسیر بدھ مت اور ویدانت کے زیر اثر کی ہے اور اس کے نتیجے میں مسلمان ''اس وقت ناکارۂ محض ہے'' اقبال نے اس تفسیر کو بغداد کی تباہی سے بھی زیادہ خطرناک قرار دیا ہے اور ان کی تمام تحریریں ایک اعتبار سے اس تفسیر کے خلاف ایک قسم کی بغاوت ہیں۔

اقبال کا مولانا رومی کے مندرجہ ذیل اشعار کو مثنوی اسرار خودی کے شروع میں درج

کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اقبال مولانا روم ہی کی طرح ایک انسان کامل کی تلاش و جستجو میں سرگرداں تھے۔

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر کز دیو و دو ملولم انسانم آرزوست
زین ہمرہان ست عناصر دلم گرفت شیر خدا و رستم دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

مثنوی اسرارِ خودی پہلی مرتبہ ۱۹۱۵ء میں شائع ہوکر منظر عام پر آئی۔ اس مثنوی نے صوفیانہ اور ادبی حلقوں میں ایک ہنگامہ برپا کیا۔ پیرزادہ مظفر احمد فضلی نے اسرارِ خودی کے جواب میں رازِ بے خودی لکھ کر اقبال کو تصوف دشمن ہی نہیں بلکہ اسلام دشمن تک قرار دیا۔ اقبال اپنے علم دوست احباب اور دیگر علماء سے خطوط اور دیگر نثری تحریروں کے ذریعے حقیقت حال کی وضاحت کرتے رہے کہ اُن کا مقصد تصوف پر حملہ کرنا نہیں بلکہ خالص اسلامی تصوف کو پیش کرنا ہے۔ بہرحال مصلحت کوشی کے پیش نظر مثنوی اسرارِ خودی سے دیباچہ اور خواجہ حافظ کے متعلق کہے گئے اشعار حذف کئے گئے، تب جاکر کے معاملہ کچھ سرد پڑ گیا۔

مشہور مستشرق پروفیسر رینالڈ۔ اے۔ نکلسن نے اسرارِ خودی کا ترجمہ "Secrets of the Self" کے نام سے کیا۔ یہ انگریزی ترجمہ ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا۔ موصوف نے دیباچے میں لکھا کہ یہ مثنوی زبردست آواز ہے جو مسلمانوں کو محمدؐ اور قرآن کی طرف بلاتی ہے اور اس آواز میں جو سوزِ صداقت ہے اس کی ہم تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتے[1]۔ اقبال کو تعجب تھا کہ جس قوم کے لئے یہ مثنوی لکھی گئی تھی وہ اس کے مفہوم کی تہہ تک پہنچنے میں ناکام ہوکر کافی دیر تک اس کے خلاف اپنے شدید ردعمل کا اظہار کرتی رہی اور جن قوموں سے اس مثنوی میں خطاب ہی نہیں کیا گیا تھا وہ اس کا مطلب سمجھ گئی ہیں۔

اقبال کا مطالعہ کافی وسیع تھا، انہوں نے فلسفہ، تاریخ، ادبیات، سیاسیات اور کئی

۱۔ فقیر سید وحیدالدین، روزگارِ فقیر، ص ۱۲۷۔

دوسرے علوم کا گہرا مطالعہ کیا تھا انہوں نے خود بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے اپنی حیات کا زیادہ تر حصہ اسلام اور اسلامی فقہ و سیاست، تہذیب و تمدن اور ادبیات کا مطالعہ کرنے میں صرف کیا ہے اور قرآن پاک ہی ان کی فکر کا سر چشمہ ہے۔ قرآن پاک میں انسان کو افلا تعقلون، افلا تدبرون جیسے الفاظ کے ذریعے تفکر و تدبر کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اقبال ایک باشعور اور حقیقی مسلمان کی طرح قرآن کی ہر آیت پر غور و فکر کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں اہلِ ایمان پر اپنی خودی کو محفوظ رکھنے اور اسے مستحکم کرنے کا فرض عائد کیا گیا ہے۔ یا ایھا الذین آمنو علیکم انفسکم لایضر کم من ضل اذا ھتدیتم الی اللہ مرجعکم جمیعاً فینبکم بما کنتم تعملون۔

(سورۃ المائدہ: آیت نمبر ۱۰۵)[۱]

شارحِ اقبال پروفیسر یوسف سلیم چشتی قرآن پاک کی اس آیت کو اقبال کے فلسفۂ خودی کا سنگ بنیاد قرار دیتے ہیں۔ جہاں تک لفظ خودی کا تعلق ہے اقبال کے عہد میں اور اُن سے پیشتر بھی خودی کا لفظ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں مستعمل رہا ہے لیکن اس لفظ کو غرور یا تکبر کے معنوں میں استعمال کیا جاتا رہا ہے، اقبال جیسی نابغہ روزگار شخصیتیں اپنے عہد یا پیشروؤں کے ہاتھوں استعمال کی گئی اصطلاحات اور لفظیات کو جوں کا توں پیش کرنے پر قانع نہیں بلکہ وہ انہیں مثبت، وسیع اور آفاقی تناظر میں دیکھنے اور ان کا تجزیہ کرنے کا غیر معمولی شعور اور ادراک رکھتی ہیں، چنانچہ انہوں نے اسرار خودی میں جب خودی کا لفظ برتا تو اسے اپنے مروجہ اور روایتی معنوں کی حدود سے نکال کر قرآن کی روشنی میں مثبت اور وسیع معناں عطا کیے، چنانچہ خودی کے لفظ اور اقبال کے فلسفۂ خودی کو اقبال کے برتے ہوئے سیاق و سباق (context) میں دیکھنے اور اس کا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے، ورنہ اس (context) سے باہر جا کر اقبال کے فلسفۂ خودی کی تفہیم میں غلط نتائج کے برآمد ہونے اور گمراہ ہونے کا قوی اندیشہ ہے۔

۱۔ ترجمہ: اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تم پر فرض ہے خودی کی حفاظت، اگر تم ہدایت پر ہو تو وہ شخص جو گمراہ ہے تمہیں کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا۔ تم سبھوں کو اللہ ہی کے پاس واپس جانا ہے اور وہ تمہیں تمہارے اعمال پر مطلع کر دے گا۔ (تا کہ ان کے مطابق جزا و سزا مل سکے)

اقبال لکھتے ہیں:

"یہ وحدت وجدانی یا شعور کا روشن نقطہ جس سے تمام انسانی تخیلات و جذبات مستیز ہوتے ہیں، یہ پراسرار شئے جو فطرت انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے، یہ خودی، یا انا "میں"، جو عمل کی رو سے ظاہر اور اپنی حقیقت کی رو سے مضمر ہے جو تمام مشاہدات کی خالق ہے مگر جس کی لطافت مشاہدے کی گرم نگاہ کی تاب نہیں لاسکی، کیا چیز ہے؟ کیا یہ ایک لازوال حقیقت ہے یا زندگی نے محض عارضی طور پر اپنی خودی عملی اغراض کے حصول کی خاطر اپنے آپ کو اس فریب تخیل یا دروغ مصلحت آمیز کی صورت میں نمایاں کیا ہے؟ اخلاقی اعتبار سے افراد و اقوام کا طرز عمل اس نہایت ضروری سوال کے جواب پر منحصر ہے اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہ ہوگی جس کے حکماء اور علماء نے کسی نہ کسی صورت میں اس سوال کا جواب پیدا کرنے کے لئے دماغ سوزی نہ کی ہو، مگر اس سوال کا جواب افراد اقوام کی دماغی قابلیت پر اس قدر انحصار نہیں رکھتا، جس قدر کہ ان کی افتاد طبیعت پر۔ مشرق کی فلسفی مزاج قومیں زیادہ تر اسی نتیجے کی طرف مائل ہوئیں کہ انسانی انا محض ایک فریب تخیل ہے اور اس پھندے کو گلے سے اتار دینے کا نام نجات ہے۔ مغربی اقوام کا عملی مذاق ان کو ایسے نتائج کی طرف لے گیا جس کے لئے ان کی فطرت متقاضی تھی"۔[1]

اقبال کے نزدیک خودی احساس نفس کا نام ہے، تعین ذات ہے۔ من عرف نفسه فقد عرف ربه۔ خودی عرفان نفس کا نام ہے۔ عرفان نفس ہی سے رب کا عرفان حاصل کیا جاسکتا ہے۔ خودی کو ایک ایسی قوت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے جو ہر شخص کے اندر موجود ہوتی

۱۔ دیباچہ اسرارِ خودی بحوالہ اقبال (مجلّہ بزم اقبال) ۱۹۵۲ء۔۱۹۵۳ء حکیم احمد شجاع، نظریۂ خودی کا صحیح مفہوم، ص ۸۲، ۸۳۔

ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر کئی صلاحیتیں پیدا کی ہیں۔ بعض اوقات اُسے غیر معمولی استعداد سے نوازا جاتا ہے۔ اس لئے ہر انسان خدا کی طرف سے ودیعت کی گئی صلاحیت کو پہچانے اور اپنی استعداد کو بیدار کرے۔ جب انسان کو اپنی استعداد یا صلاحیت کا علم ہو جائے تو اس پر لازم آتا ہے کہ وہ ان صلاحیتوں کو بروئے کار لائے۔ لیکن ان صلاحیتوں یا قوت کو انسان کی ضرر رسانی کے لئے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے اور کیا جاتا رہا ہے۔ پہلی صورت میں خودی کو اعلیٰ ترین مقصد کے تابع کیا جاتا ہے۔ مسلمان پر فرض ہے کہ وہ اپنی خودی کو قانونِ الٰہی کے تابع کرے اور جب خودی قانونِ الٰہی کی پابند ہو جائے تو اقبال کے الفاظ میں 'مسلمان ہو جاتی ہے'۔ اقبال لکھتے ہیں:

> ''خودی خواہ مسولینی کی ہو، خواہ ہٹلر کی، قانونِ الٰہی کی پابند ہو جائے تو مسلمان ہو جاتی ہے۔ مسولینی نے حبشہ کو محض جوالارض کی تسکین کے لئے پامال کیا، مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانے میں حبشہ کی آزادی کو محفوظ رکھا۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ پہلی صورت میں خودی کسی قانون کی پابند نہیں۔ دوسری صورت میں قانونِ الٰہی اور اخلاق کی پابند ہے''۔[1]

اسرارِ خودی کے عنوان ''در بیان اینکہ اصل نظامِ عالم از خودی است و تسلسل حیات وجود بر استحکام خودی انحصار دارد'' کے تحت اقبال نے بتایا ہے کہ نظامِ عالم کی اصل خودی سے ہے اور تعینات وجود کی حیات کا تسلسل خودی کے استحکام پر انحصار رکھتا ہے۔ اقبال کے نزدیک کائنات کا وجود یا پیکرِ ہستی خودی ہی کا نتیجہ ہے ماسواء کا وجود خدا کی خودی سے سرزد ہوا ہے۔ خودی کا اثبات اس وجہ سے ہوا کہ خودی نے اپنا غیر پیدا کیا۔

صد جہاں پوشیدہ اندر ذاتِ اُو — غیر او پیداست از اثباتِ اُو
در جہان تخم خصومت کاشت است — خویشتن را غیر خود پنداشت است

۱۔ اقبال نامہ، حصہ اول، (مرتبہ شیخ عطاء اللہ)، ص ۲۰۲۔

سازد از خود پیکرِ اغیار را تا فزاید لذت پیکار را

خودی کو جن عناصر ثلاثہ سے تقویت حاصل ہوتی ہے، وہ ہیں عمل، رزقِ حلال اور عشق، جب کہ بے عملی، رزق حرام اور بے یقینی خودی میں ضعف پیدا کر دیتی ہے۔ حیات خودی کا انحصار مقصد آفرینی پر ہے۔ مدعا یا مقصد آفرینی سے انسان کی زندگی کو بقاء حاصل ہوتا ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی زندگی کا کوئی نیک مقصد متعین کر لے اور پھر اس کے حصول کیلئے جدوجہد کرے، زندگی کیلئے آرزو کا ہونا ناگزیر ہے کیونکہ اگر انسان کا دل آرزو سے عاری ہو جائے تو اُسے زندہ نہیں، مردہ قرار دیا جاتا ہے۔

زندگانی را بقا از مدعا است کاروانش را درا از مدعا است
زندگی در جستجو پوشیدہ است اصل او در آرزو پوشیدہ است
آرزو را در دل خود زندہ دار تانگردد مشتِ خاک تو مزار
آرزو جانِ جہاں رنگ و بوست فطرت ہر شئے امین آرزوست

حکیم احمد شجاع اپنے مضمون ''نظریۂ خودی کا صحیح مفہوم'' میں اس ضمن میں یوں رقمطراز ہیں:

> ''دل کی حرارت آرزو پر منحصر ہے اور آرزو جستجو کی محرک ہے، جستجو کی یہی سرگرمیاں جو ہر شخص کے قوائے فعالیہ کی استعداد پر منحصر ہوتی ہیں، انسان کی زندگی کا تعین کرتی ہیں۔ پس ہر شخص اپنی زندگی کا تعین ایک ہی مدعا کی جستجو سے نہیں کر سکتا۔ انہیں امور کا تعین، تعین ذات ہے اور انہیں محسوسات کا احساس، احساس نفس ہے''۔[1]

انسان کا اصل مقصد نیابت الٰہی ہے۔ انسان کا مقصد ؎ ''شعلہ بن کر پھونک دے خاشاک غیر اللہ کو'' کے مصداق ہو، اُسے چاہیے کہ ماسوی اللہ سے بیگانہ ہو جائے اور ماسوی اللہ سے اُسے صرف اللہ کی محبت ہی بیگانہ کر سکتی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے

۱۔ اقبال (مجلہ بزم اقبال) ۵۲۔۱۹۵۳ء، حکیم احمد شجاع، نظریۂ خودی کا صحیح مفہوم، ص ۸۷۔

لئے اسے مندرجہ ذیل مقاصد پیش نظر رکھنے ہونگے۔ وہ دین کا علم حاصل کرلے، اہل اللہ کی صحبت اختیار کرے، اکل حلال کی تلاش کرے، خدمت بنی آدم کو اپنا شعار بنائے، جہاد باللسان، جہاد بالقلم، جہاد بالمال، جہاد بالسیف اور جہاد بالنفس کرے۔

خودی عشق سے استوار ہوتی ہے۔ اقبال کے یہاں عشق اور خودی دو ہم معنی مضامین ہیں۔ یہ ایک ہی چیز ہے جسے وہ کبھی عشق کا نام دیتے ہیں اور کبھی خودی کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ خودی کے اندر لامتناہی ممکنات پوشیدہ ہیں۔ خودی کو استحکام عطا کرنا ان لامتناہی ممکنات کو ظہور میں لانا ہے۔ اقبال کے نزدیک عشق خودی کو استحکام عطا کرتا ہے، سوال پیدا ہوتا ہے کہ کون سی ایسی ہستی ہے جس سے عشق پیدا کیا جائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عشق کسی دنیاوی محبوب کے گرویدہ ہونے کا نام نہیں بلکہ ان ہستیوں سے عشق پیدا کرنا مطلوب ہے جنہوں نے اپنی خودی کے ممکنات کو وجود پذیر کرکے اپنی خاک کو رشک افلاک بنایا ہے۔

ہست معشوقے نہان اندر دلت چشم اگر داری بیا، بنمائمت
عاشقان او ز خوبان ، خوب تر خوشتر و زیبا تر و محبوب تر
دل ز عشق او توانا میشود خاک ہمدوش ثریا می شود

انسان کو چاہیے کہ وہ دنیا کی عظیم ترین ہستی محمد مصطفیٰؐ کی ذات اقدس سے عشق پیدا کرے۔ آپؐ کی ذاتِ اقدس سے عشق پیدا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ کے طرزِ حیات اور اصولوں کا اتباع کیا جائے۔ حضور پرنورؐ نے غارِ حرا میں خلوت گزینی اختیار کرکے اپنی خودی کے جوہر کو آب وتاب عطا کی۔ انسان کو چاہیئے کہ وہ بھی آپؐ کی اتباع کرکے اپنی خودی کو استحکام عطا کرے۔

اسرارِ خودی کے اگلے عنوان، در بیان اینکہ خودی از سوال ضعیف میگردد" کے تحت اقبال نے سوال کرنے یا دوسروں کے سہارے زندگی بسر کرنے کو مذموم قرار دیتے ہوئے انسان کو حُباب سے غیرت مندی اور خودداری کا سبق حاصل کرنے کی تلقین کی ہے، جو دریا

میں رہ کر بھی اپنا پیمانہ نگوں رکھ کر اپنی خودداری اور غیرت مندی کو ہر قیمت پر برقرار رکھتا ہے۔ اقبال نے انسان کو اپنی قوتِ بازو سے رزق حلال حاصل کرنے اور اپنی خودداری کو قائم ودائم رکھنے کی تاکید کی ہے کیونکہ انسان سعی کو ترک کر کے دوسروں کا محتاج ہو جاتا ہے اور احتیاج اور ناداری شیروں کو بھی روباہ بنا دیتی ہے۔ احتیاج کے نتیجے میں انسان کے خیالات میں پستی آنے لگتی ہے۔ احتیاج سے محفوظ رہنے کی صورت یہ ہے کہ انسان خدا کی طرف سے عطا ہوئی زندگی کی قدر کرے اور زندگی کے اوقات کا صحیح استعمال کرے تا کہ اُسے دوسروں کا منت پذیر نہ ہونا پڑے۔ منت غیر سے محفوظ رہنے کے سلسلے میں اقبال نے حضرت عمرؓ کی بے منتِ غیر جینے والی زندگی سے ایک مثال پیش کی ہے کہ وہ ایک مرتبہ تازیانہ اٹھانے کے لئے خود اونٹ سے اترے اور کسی دوسرے کا احسان نہ لیا۔ خودی سوال کرنے سے کمزور پڑ جاتی ہے۔ حضرت محمد مصطفیٰؐ نے دوسروں کے سامنے دست سوال دراز کرنے کو نہایت مذموم قرار دیا ہے اور جو شخص فرمان نبیؐ پر عمل پیرا نہیں ہوتا روزِ حشر کو اُسے حضور کے سامنے خفت اٹھانی پڑے گی۔ انسان خواہ کتنا ہی تنگ دست کیوں نہ ہو، اُسے دوسروں کے سامنے دست سوال دراز کرنے سے منع کیا گیا ہے، مزدور اللہ کا حبیب ہے اور بے منت غیر جینے والا شخص ہی صحیح معنوں میں خوددار انسان ہے ایسے شخص کو اقبال ان الفاظ میں خراج پیش کرتے ہیں:

اے خنک آن تشنہ کاندر آفتاب می نخواہد از خضر یک جام آب
تر جبین از خجلت سائل نشد شکل آدم ماند و مشت گل نشد
زیر گردون آن جوان ارجمند می رود مثلِ صنوبر سربلند
در تہی دستی شود خوددار تر بخت او خوابید و او بیدار تر
قلزم زنبیل سیل آتش است گر ز دست خود رسد شبنم خوشت

اگلا عنوان ہے۔ ”در بیان اینکہ چوں خودی از عشق و محبت محکم میگردد قوائے ظاہرہ و مخفیۂ نظام عالم را مسخر می سازد“ یعنی جب عشق کی بدولت خودی میں استحکام پیدا ہوتا ہے تو یہ نظام عالم کی ظاہری اور باطنی قوتوں کو تسخیر کر لیتی ہے یعنی کائنات پر حکمران ہو جاتی ہے۔“

از محبت چون خودی محکم شود قوتش فرماندہ عالم شود

اسرارخودی کے حوالے سے اقبال کے بیانات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خودی کے موضوع پر کافی عرصہ سے غوروفکر کرتے رہے ہیں۔ امت مسلمہ کی پستی اور انحطاط کے اسباب کا سراغ لگاتے ہوئے اقبال اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ نفیٔ خودی کا مسئلہ مغلوب اقوام کی اختراع ہے تاکہ اس کی مدد سے اقوام غالب کے اخلاق کو کمزور کیا جائے۔ اقبال نے اس مسئلہ کو ایک حکایت کی مدد سے سمجھانے کی کوشش کی ہے جس کے بیان کرنے سے ان کا مقصود یہ ہے کہ غالب اور مغلوب دونوں اپنی اپنی بقاء کے لئے کس طرح راہیں تلاش کر لیتے ہیں، اقبال کے نزدیک مسلمانوں کے انحطاط اور زوال کا سب سے بڑا سبب عجمی تصوف ہے جس کے زیر اثر مسلمانوں میں ترکِ دنیا سے ترکِ عمل کے نتیجے میں انسان یقینی طور پر دوسروں کا محتاج ہوجاتا ہے۔ اقبال کے نزدیک افلاطون کے افکار و خیالات نے مسلمانوں کے تصوف اور ادبیات کو گہرے طور پر متاثر کیا۔ انہوں نے افلاطون کے مسلک کو مسلک گوسفندی قرار دیکر اس سے احتراز کرنے کو واجب قرار دیا ہے۔ اقبال نے افلاطون کو راہب دیرینہ کے لقب سے یاد کیا ہے۔ انہیں افلاطون کی عظمت فکر سے انکار نہیں لیکن ؎

گفت سرِ زندگی در مردن است شمع را صد جلوہ از افسردن است
گوسفندی در لباس آدم است حکم او برجان صوفی محکم است

افلاطون کے نزدیک کائنات میں نظر آنے والی جزئیات کا وجود حقیقی نہیں بلکہ موہوم ہے اس لئے اس تمام تر کائنات کا وجود موہوم ہے۔

بسکہ از ذوق عمل محروم بود جان او وارفتۂ معدوم بود
منکرِ ہنگامۂ موجود گشت خالقِ اعیان نامشہود گشت

جب انسان اس دنیا کے ہنگامہ کا منکر ہوجائے یا اسے محض فریب، نظر یا دھوکہ قرار دے تو پھر اس کے حصول کی کوشش کرنا ہی بیکار ہے اسے مسخر کرنیکا تو سوال ہی پیدا نہیں

ہوتا۔ اقبال نے افلاطون کے نظریۂ اعیان کی شدید مخالفت اس لئے کی ہے کہ یہ انسان کو رہبانیت کی طرف لے جاتا ہے۔ رہبانیت اسلام کی ضد ہے۔ قرآن کی نظر میں یہ دنیا فریب نظر یا دھوکہ نہیں ہے بلکہ اس کو مسخر کرنا اور اس پر اللہ کی حکومت قائم کرنے کے لئے انسان کی تخلیق کی گئی ہے۔ قرآن انسان کو قوت حاصل کرنے کی تلقین اس لئے کرتا ہے تاکہ وہ کائنات کی تسخیر کر سکے۔ کائنات کی تسخیر کرنے کے بعد اپنی قوت کو قانونِ الٰہی کے تابع کرے تاکہ انسان کی طاقت بنی آدم کے حق میں رحمت کا باعث بن سکے۔ اقبال کے مردِ مومن پر نطشے کے اثرات بتائے جاتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقبال کے مردِ مومن پر نطشے کے بجائے الجیلی[1] کا گہرا اثر ہے۔

جہاں تک نطشے[2] کے Super man کا تعلق ہے اس کے نزدیک انسان اس لئے قوت حاصل کرے تاکہ انسانوں پر غالب آیا جائے۔ جب کہ اقبال اس نظریئے کے بالکل مخالف نظریہ رکھتے ہیں، اقبال اور نطشے دونوں مفکرین کے یہاں بعض چیزوں میں سطحی مشابہت کے باوجود دونوں کے فکری رویئے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

مثنوی اسرارِ خودی کا ایک عنوان ''درحقیقت شعر و اصلاح ادبیات اسلامیہ'' کے عنوان

۱۔ الجیلی کی مشہور تصنیف ''الانسان کامل'' ہے اس کا اردو میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

۲۔ اقبال اور نطشے دونوں انسان کی ضعف پسندی اور نفی خودی کے سخت مخالف ہیں۔ نطشے انسان کی قوت کے اس لئے آرزومند ہیں تاکہ ایک اعلیٰ تر نوع حیوان وجود میں آسکے جب کہ اقبال انسان کے قوت تسخیر کے اس لئے خواہشمند ہیں تاکہ اس کی خودی ''قوی ہوتے ہوتے یہاں تک پہنچ جائے کہ اس میں صفات الٰہی کی شان جھلکنے لگے'' اقبال نے انسان کامل اور نطشے نے فوق الانسان کا نظریہ پیش کیا۔ لیکن اس سلسلے میں دونوں مفکروں کی توضیحات اور تشریحات بالکل جدا جدا نوعیت کی حامل ہیں۔ اقبال اور نطشے کے یہاں اس طرح کی سطحی مشابہت کے پیش نظر اقبال پر نطشے کے گہرے اثرات بتائے گئے ہیں لیکن اقبال نے نطشے کی تقلید اور تتبع سے صاف انکار کیا ہے۔ اقبال کے بیان کے مطابق اسرار خودی کی تصنیف سے بہت عرصہ پہلے انہوں نے انسان کامل کے متصوفانہ عقیدہ پر غالباً ایک مضمون تحریر کیا تھا جب کہ نطشے کی کتابیں ان کی نظروں سے بھی نہیں گزری تھیں اور نہ ہی نطشے کے عقائد کا غلغلہ ان کے کانوں تک پہنچا تھا۔

سے مخصوص ہے مذکورہ عنوان کے تحت اقبال نے ایسے ادبیات کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے جس نے قوم کی اخلاقیات کو تباہ کر دیا ہے انہوں نے قوم کے اندر تحرّک اور فعالیت پیدا کرنے والی شاعری کی سراہنا کی ہے۔ اقبال نے یہاں پر ایک مرتبہ پھر انسانی زندگی میں آرزو کی ضرورت اور اہمیت پر زور دیا ہے جس کی بدولت انسان زندگی میں جوش اور ولولے کے ساتھ کام کرتا ہے۔ شعراء حضرات کو دو گروہوں میں منقسم کیا گیا ہے، ایک گروہ وہ ہے جو نوجوانوں کو اخلاقی اعتبار سے تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ شعراء کا دوسرا گروہ وہ ہے جو تلمیذالرحمان ہوتا ہے۔ اقبال کی رائے میں شاعری کا مطلب زندگی کے تلخ حقائق سے آنکھ ملانا اور ان کا پامردی کے ساتھ مقابلہ کرنا ہے۔ زندگی کے حقائق سے آنکھیں چرانے والے شعراء اقبال کی نظر میں قوم کے دشمن ہیں۔ حقیقی شاعر وہ ہے جو انسان کو جدوجہد کرنے کی تلقین کرے۔ وہ شاعری جو انسان کو ذوقِ عمل سے بیگانہ کر دے، انسان کے حق میں افیون ہے۔ اقبال شعراء حضرات کو مشورہ دیتے ہیں کہ قوم آپ سے زندگی کو استحکام عطا کرنے والی شاعری کا تقاضا کرتی ہے۔ مسلمان شعراء کو اپنی شاندار اور عظیم اسلامی روایات کو ملحوظ رکھنا چاہیے اُن کا نقطہ نظر اسلامی ہونا چاہیے۔ اقبال کے نزدیک عرب شاعری میں حقیقت پروری اور ہمت افزائی تھی اس میں بادِ صحرا کی گرمی اور بادِ صرصر کی تندی تھی۔ عجمی افکار اور جذبات نے اسلامی ادب کو زندگی کی قوتوں سے بیگانہ کر دیا۔

اے ہما از یمن دامت ارجمند　　آشیانے ساز بر کوہِ بلند
آشیانے برق و تندر در برے　　از کنامِ جرہ بازان برترے
تاشوی در خورد پیکار حیات　　جسم و جانت سوزد از نارِ حیات

خودی کی تربیت کے تین مراحل ہیں۔ پہلا مرحلہ اطاعت، دوسرا مرحلہ ضبطِ نفس اور تیسرا مرحلہ نیابت الٰہی، کائنات کی مختلف اشیاء پر غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک مخصوص قانون یا نظام کی پابند ہیں۔ انسان چونکہ اشرف المخلوقات ہے۔ نائب حق ہے، مسجود ملائک ہے، اس لئے وہ قدرت کے قانون یا نظام سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ اس پر

بھی قانون الٰہی کی پابندی لازم ہے۔ انسان بعض معاملات میں اگرچہ مجبور محض ہے تاہم اس مجبوری کے ساتھ ساتھ اسے اختیار کی نعمت سے بھی سرفراز فرمایا گیا ہے۔ قانون الٰہی کی اطاعت کرنے میں اسے اپنی ذات پر اپنی غفلت کی وجہ سے بظاہر ایک جبر سا محسوس ہوتا ہے لیکن یہ جبر ایک اختیار لئے ہوئے ہے۔

در اطاعت کوش اے غفلت شعار　　می شود از جبر پیدا اختیار
دہر میں عیش دوام آئین کی پابندی سے ہے　　موج کو آزادیاں سامانِ شیون ہو گئیں

واقعہ یہ ہے کہ جب ایک انسان قانونِ الٰہی کی حدود کے اندر رہ کر عمل کرنے لگتا ہے۔ تو اس کی سیرت میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس قانون یا نظام کے تحت عمل کرنا اس کا معمول بن جاتا ہے۔ کائنات کی ہر شئے چونکہ ایک مخصوص نظام کی پابند ہے اور اسی پابندی کی بدولت ان اشیاء کا وجود قائم و دائم ہے۔ ورنہ قانون کی حدود سے باہر رہ کر انتشار کے خدشات کا پیدا ہونا یقینی بن جاتا ہے۔ اقبال انسان کو قانونِ الٰہی اور شریعت محمدیؐ کا پابند ہونے کی تلقین کرتے ہیں۔ قانونِ الٰہی یا نظام حق کی اطاعت کرنا بڑا ہی دشوار کام ہے لیکن مسلمان کو حدودِ مصطفٰےؐ یا شریعت محمدیؐ سے ہرگز باہر نہ رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔

شکوہ سنج سختیٔ آئین مشو　　از حدود مصطفٰےؐ بیرون مرد

ضبط نفس تربیت خودی کا دوسرا مرحلہ ہے انسانی نفس کو ایک بے لگام گھوڑے سے مشابہہ کیا جائے تو غالباً غلط نہ ہوگا۔ اصل میں تربیت خودی کا پہلا اور دوسرا مرحلہ باہم دگر گہرے طور پر وابستہ ہیں یا دوسرے لفظوں میں انہیں لازم و ملزوم کہا جا سکتا ہے۔ اطاعت کے لئے ضبط نفس لازمی ہے انسان اپنی بری خواہشات پر قابو پائے اور نیک خواہشات کی جستجو کرے۔ ضبط نفس سے یہ مراد نہیں کہ انسان اپنی زندگی سے آرزو یا خواہش کو قبیح سمجھ کر خارج کر دے۔ آرزو یا خواہش ہی زندگی کا دوسرا نام ہے اقبال نے خواہش یا آرزو کو انسان کی زندگی میں بڑی اہمیت کا حامل بتایا ہے مگر یہ آرزو، زن، زر اور زمین کے حصول کے لئے پیدا نہ کی جائے بلکہ اسے نیک مقاصد کے حصول کے لئے پیدا کیا جائے۔ انسان اپنی

خواہشات اور آرزوں کو نیک مقاصد کے لئے وقف کردے جب ہی وہ کائنات کو مسخر کرنے کا اہل ہوسکتا ہے۔اس کی مرضی خدا کی مرضی اور اس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ ہوجاتا ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے　　خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کی ہے

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ　　غالب و کار آفریں کار کشا کار ساز

اقبال کی نظر میں انسان کی عظمت کا جو تصور ہے اس نے بعض حلقوں میں ایک ہلچل سی پیدا کردی، حتیٰ کہ بعض ناقدین یہ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ اقبال نے انسان کو خدا بنادیا ہے۔اقبال نے اس نوع کے تاثرات یا بیانات کے نتیجے میں انسان کی عظمت کے تصور کو مزید رفعت عطا کرکے کہا۔

از قم او خیزد اندر گورتن　　مردہ جانہا چوں صنوبر درچمن

ذات او توجیہہ ذات عالم است　　از جلال او نجات عالم است

جلوہ ہا خیزد ز نقش پائے او　　صد کلیم آوارہ سینائے او

تربیت خودی کا تیسرا مرحلہ نیابت الٰہی ہے۔نائب حق بننے کے لئے اقبال صحبت مرشد کو ناگزیر قرار دیتے ہیں۔نائب حق کی خصوصیات گنواتے ہوئے کہتے ہیں

نائب حق در جہان بودن خوش است　　بر عناصر حکمران بودن خوشت

نائب حق ہمچو جان عالم است　　ہستی او ظل اسم اعظم است

از رموزِ جزو و کل آگاہ بود　　در جہاں قائم بامراللہ بود

خیمہ چون در وسعت عالم زند　　ایں بساط کہنہ را برہم زند

نائب حق انسانوں کے حق میں بشیر ہوتا ہے، نذیر ہوتا ہے اس کی ہیبت سے دریائے نیل خشک ہوجاتا ہے۔

از قم او خیزد اندر گورتن　　مردہ جانہا چون صنوبر درچمن

ذات او توجیہہ ذات عالم است　　از جلال او نجاتِ عالم است

ذرہ خورشید آشنا از سایہ اش　　قیمت ہستی گران از مایہ اش

جلوہ ہا خیزد ز نقش پائ او صد کلیم آوارہ ی سینای او
زندگی را می کند تفسیر نو می دہد این خواب را تعبیر نو

خلیفہ عبدالحکیم کے الفاظ میں بندہ ''عبودیت میں کامل ہوکر اور خدا کی ذات کو اپنی ذات میں سموکر جو فعل کرتا ہے اُس کے فعل میں اور خدا کے فعل میں کوئی فرق نہیں رہتا''۔[1]

اس کے بعد اسمائے حضرت علیؓ کے اسرار کی تشریح کی گئی ہے۔ حضرت علیؓ میں علم عشق اور جہاد یعنی عمل جیسی تین خوبیاں بیک وقت جمع ہوگئیں تھیں۔ حضرت علیؓ کے چار القاب، یداللہ، کرّار اور دروازہ شہر علوم کو بیان کرتے ہوئے ہر لقب کی وضاحت کرکے آپؓ کی حیات سے مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ آگے چل کر کئی حکایات مثلاً اس نوجوان کی حکایت جو مرو سے چل کر لاہور شیخ علی ہجویری کی خدمت میں اس لئے حاضر ہوا تھا کہ وہ اپنے دشمنوں سے زبردست خائف تھا اور شیخ علی ہجویری سے زندگی بسر کرنے کا کوئی طریقہ چاہتا تھا اس حکایت کے بیان کرنے سے اقبال کا یہی مقصد ہے کہ انسان اپنے دل سے خوف و ہراس نکال کر اپنے اندر کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرکے انہیں بروئے کار لائے تاکہ اس کی خودی مستحکم ہوسکے کیونکہ

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

اس کے بعد چند اور حکایات ''حکایات طائرے کہ از تشنگی بیتاب بود'' اور ''حکایت الماس و زغال''، ''حکایت شیخ و برہمن''، ''و مکالمہ گنگا و ہمالہ در معنی ایں کہ تسلسل حیات ملیہ از محکم گرفتن روایات مخصوصہ ملّیہ می باشد'' کے بیان کرنے سے اقبال انسان کی خودی کو مستحکم کرنے اور ہر لمحہ خودی کا تحفظ کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔

غافل از حفظ خودی یک دم مشو ریزہ الماس شو، شبنم مشو

کیونکہ جو انسان اپنی خودی کے تحفظ سے غفلت برتتا ہے اس پر موت واقع ہوجاتی ہے۔ مندرجہ بالا حکایات کے بعد ''در بیان ایں کہ مقصد حیات مسلم اعلائے کلمۃ اللہ است و جہاد اگر محرک آن جوالارض باشد در مذہب اسلام حرام است'' کے عنوان کے تحت بتایا گیا ہے کہ

۱۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، فکر اقبال، ص ۲۹۵۔

مسلمان کی حیات کا مقصد کرۂ ارض پر اللہ کے کلمہ کا بول بالا کرنا ہے اور جہاد کا محرک اگر جوع الارض ہوتو وہ مذہب اسلام میں حرام ہے۔ جہاد کا اصل مقصد فی سبیل اللہ ہے لیکن اگر جہاد کسی کو غلام بنانے کے لئے کیا جائے تو اُسے جہاد نہیں بلکہ جنگ وجدل کے نام سے موسوم کیا جاسکتا ہے جو ہر حال میں 'حرام ہے ناجائز ہے'۔

اس کے بعد تین بندوں پر مشتمل ایک عنوان ''اندرز میر نجات نقشبند المعروف بہ بابای صحرائی کہ برای مسلمانان ہندوستان رقم فرمودہ است'' کے پہلے بند میں بتایا گیا ہے کہ زندگی کیا چیز ہے؟ علم وحکمت سے استفادہ کا کیا طریقہ ہے اور مسلمان کے لئے کون سا علم مفید ہے؟ دوسرے بند میں عہد حاضر کی دانش اور مغربی تہذیب کی مذمت کرنے کے بعد اس کے مفاسد کی وضاحت کی گئی ہے اور مسلمانوں کو اس سے اجتناب کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

دانش حاضر حجاب اکبر است　　بت پرست و بت فروش و بت گر است

تیسرے بند میں مسلمانانِ ہند کی حالت زار پر تبصرہ کرکے ان کے زوال کے اسباب کی جانب اشارہ کیا گیا ہے اور واعظ اور صوفی دونوں کی ملت فروشی کا ماتم کیا گیا ہے۔

واعظان ہم صوفیان منصب پرست　　اختبار ملت بیضا شکست

واعظِ ما چشم بر بُت خانہ دوخت　　مفتی دین مبین فتوے فروخت

چیست یاران بعد ازین تدبیر ما

رُخ سوئے میخانہ دارد پیر ما

اس کے بعد ایک نہایت ہی اہم عنوان ''الوقت سیف'' ہے، جسے حضرت امام شافعی کا مقولہ بتایا جاتا ہے۔ اقبال ایک بڑے مفکر کی طرح مسئلہ زماں پر سنجیدگی کے ساتھ غور وفکر کرتے رہے ہیں۔ ''اسرارِ خودی'' میں ''الوقت سیف'' کے زیر عنوان اشعار میں تصور زماں کے سلسلے میں اُن کی فکر میں بڑی بالیدگی، پختگی، گہرائی، اور وسعت ملتی ہے۔ اسرار کے علاوہ بھی تصور زمان کو اقبال نے اپنی دوسری تصانیف جیسے بال جبریل، ضربِ کلیم، پیام مشرق، جاوید نامہ اور زبور عجم میں موضوع فکر بنایا ہے۔ ان منظوم تصانیف کے علاوہ اپنے انگریزی

خطبات "Reconstruction of Religious Thought in Islam" میں مسئلہ زماں کو اتنی اہمیت دی ہے کہ اسے مسلمانوں اور انسانوں کے لئے زندگی اور موت کا سوال قرار دیا ہے۔ ''پیام مشرق'' میں 'نوائے وقت' میں زمانے کی حقیقت بیان کرتے ہوئے اقبال لکھتے ہیں:

درمن نگری ہلیچم درخود نگری جانم

اور دوسری جگہ:

از جان تو پیدایم در جہاں تو پنہانم

بال جبریل کی نظم ''زمانہ'' کے مطابق حقیقی زمان زندگی کا دوسرا نام ہے۔

میرے خم و پیچ کو نجومی کی آنکھ پہنچانتی نہیں ہے ہدف سے بیگانہ تیر اُس کا نظر نہیں جس کی عارفانہ

جاوید نامہ کی رُو سے زمان کی روح انسان سے کہتی ہے کہ میں کائنات پر حکمران ہوں۔ جہاں تک مثنوی ''اسرار خودی'' کا تعلق ہے اس میں اقبال نے تین بندوں پر مشتمل ''الوقت سیف'' کے عنوان کے تحت تصور زمان کو پیش کیا ہے جیسا کہ ابھی ذکر کیا گیا کہ الوقت سیف معروف بزرگ حضرت امام شافعیؒ کا ایک قول ہے جسے اقبال نے مثنوی اسرارِ خودی میں مسئلہ زمان کو پیش کرنے کے لئے عنوان کے طور پر برتا ہے۔ اس عنوان کے تحت پیش کئے گئے اشعار میں اقبال نے بتایا ہے کہ زمان کوئی منجمد یا ساکن حقیقت نہیں ہے بلکہ یہ ایک تخلیقی حرکت کا نام ہے۔ انسان زمان کو اپنی نافہمی کے باعث ماضی، حال اور مستقبل میں تقسیم کرتا ہے۔ اسے زمان کا مادی یا ظاہری پہلو ضرور قرار دیا جا سکتا ہے لیکن اقبال کے نزدیک زمان کو شب و روز کے آلے سے ناپنے والے یا زمان کو ماضی، حال اور مستقبل میں تقسیم کرنے والے زمان کے حقیقی تصور سے آگاہ نہیں ہو سکتے۔ دراصل زمان کا ایک مادی مفہوم ہے اور ایک حقیقی مفہوم ہے لیل و نہار کے انقلاب سے زمان کا ایک مفہوم ضرور ظاہر ہوتا ہے اور اقبال اسے بھی سمجھنے کو لازم قرار دیتے ہیں۔

گردشِ گردون گردان دیدنی است انقلاب روز و شب فہمیدنی است

قرآن کی رُو سے اختلاف لیل ونہار میں خدا کی قدرت کی نشانیاں مضمر ہیں۔ اقبال زمان کے متعلق اپنا ایک مخصوص اور منفرد نظریہ رکھتے ہیں۔ اس نظریئے میں مغربی مفکر برگسان کے زور فکر اور قوت استدلال نے بڑی وسعت اور گہرائی پیدا کی ہے۔ اقبال نے برگسان کے فلسفے سے اکتساب فیض کرنے کا خود بھی اعتراف کیا ہے۔ تصور زمان کے متعلق اقبال اور برگساں دونوں کے افکار میں مماثلت ملتی ہے۔ اقبال گول میز کانفرنس کے سفر کے دوران اپنے ہم فکر مفکر برگساں سے تبادلہ خیالات کرنے کے خواہاں تھے۔ جب دونوں کی ملاقات ہوئی۔ اقبال نے برگسان کو دوران گفتگو دہر کے متعلق حدیث ''لاتسبو الدھر فانی دھرھو اللہ'' سنائی تو اقبال کے الفاظ میں برگسان یہ حدیث سن کر اُچھل پڑا اور اس کی روح بے انتہا مسرت سے لبریز ہوگئی کہ ایک نبیؐ عظیم کے قلب پر وہی حقیقت وارد ہوئی جسے وہ استدلال اور ذاتی وجدان کی بناء پر دنیا کے سامنے عمر بھر پیش کرتا رہا۔ اسرار خودی کے عنوان ''الوقت سیف'' کے تحت آنے والے اشعار میں دہرِ خلاق کو ایک شمشیر سے تعبیر کرتے ہوئے اس کے سفر کو مدام جاری قرار دیتے ہوئے اس کی خلاقی قوتوں کو مختلف پیغمبروں کے یہاں کارفرما بتایا گیا ہے۔

سبز بادا خاک پاک شافعی　　عالمی سرخوش ز تاکِ شافعی
فکر او کوکب زگردون چیدہ است　　سیف بران وقت رانا میدہ است
من چہ گویم سرِ این شمشیر چیست　　آب او سرمایہ دار از زندگیست
صاحبش بالا تر از امید و بیم　　دستِ او بیضا تر از دستِ کلیمؑ
سنگ از یک ضربت او تر شود　　بحر از محرومی نم بر شود
در کفِ موسیٰؑ ہمین شمشیر بود　　کار او بالا تر از تدبیر بود
سینۂ دریائے احمر چاک کرد　　قلزمے را خشک مثلِ خاک کرد
پنجۂ حیدرؓ کہ خیبر گیر بود　　قوت اُو از ہمین شمشیر بود

ان اشعار میں دہر کا جو تصور پیش کیا گیا ہے وہی اس کا حقیقی تصور ہے اور دہر کے اس

حقیقی تصور پر دوش وفردا کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ اور نہ ہی اس میں گردش روز وشب کے کسی عمل کا دخل ہے۔

اصل وقت از گردش خورشید نیست　　وقت جاوید است وخود جاوید نیست
عیش وغم عاشور وہم عید است وقت　　سرِ تاب ماہ وخورشید است وقت
وقت را مثل مکاں گستردۂ　　امتیاز دوش و فردا کردۂ
اے چوبو، رم کردہ از بستان خویش　　ساختی از دستِ خود زندان خویش

اور خدا کے یہاں جو وقت ہے وہ ہمارے تصور وقت سے قطعی مختلف ہے۔

وقت ماکو اول و آخر ندید　　از خیابان ضمیر ما دمید
زندہ از عرفانِ اصلش زندہ تر　　ہستی او از سحر تابندہ تر
زندگی از دہر و دہر از زندگی است　　لا تسبوالدہر فرمانِ نبیؐ است

عرفان نفس حاصل کر کے زندگی سے آگاہ ہونے اور زندگی کی قوتوں کو وسعت دینے والے انسان کا وقت بھی ماضی، حال اور مستقبل میں تقسیم کی گئی کوئی مکانی قسم کی چیز نہیں۔ عرفان ذات حاصل کر کے زمان ومکان پر قدرت حاصل کرنے والے حیاتِ جاوداں سے آگاہ نہیں۔ خودی کی ماہیت حیاتِ جاوداں ہے۔ ''الوقت سیف'' کے دوسرے بند میں عبد اور حُر کے درمیان فرق بتاتے ہوئے اپنے من میں استغراق پیدا کرنے اور راز وقت کو سمجھنے کی تلقین کی گئی ہے۔ عبد لیل ونہار کا شکار ہو جاتا ہے اور وہ شب وروز کا کفن پہن لیتا ہے وہ پرندے کی طرح شب وروز کے دام میں اسیر ہو کر رہ جاتا ہے اور اپنے اوپر لذت پرواز کو حرام کر دیتا ہے۔

عبد را ایام زنجیر است و بس　　بر لب او حرف تقدیر است و بس

عبد پر زمانہ حکمراں ہوتا ہے لیکن حُر زمانے پر حکمراں ہوتا ہے۔ حُر ہمیشہ انقلاب برپا کرتا رہتا ہے۔ عبد گردش افلاک اور نیرنگی تقدیر کا شاکی ہوتا ہے جب کہ حُر خود تقدیر یزداں بن جاتا ہے اور اُس کی ہمت قضائے ایزدی کی ہمدم بن جاتی ہے۔

ہمت حر باقضا گردد مشیر　　حادثات از دست او صورت پذیر

جاوید نامہ کی روشنی میں اقبالؔ کا تصورِ ابلیس

اللہ تعالیٰ نے جب فرشتوں کو آدم کے سامنے سر بہ سجود ہونے کا حکم دیا تو تمام فرشتے آدم کے سامنے سر بہ سجود ہوئے۔ اس طرح آدم سجود ملائک قرار پایا۔ صرف ایک ابلیس ہے جس نے حکم خداوندی کی تعمیل کرنے سے انکار کر دیا اور وہ ہمیشہ کے لئے راندۂ درگاہ ہوا۔ ابلیس نے آدم کو سجدہ نہ کرنے کا یہ سبب بتایا کہ آدم کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے جب کہ مجھے آگ سے خلق کیا گیا ہے چنانچہ آدم کو اُس نے اپنے سے فروتر تصور کیا اور کہا کہ اسی سبب کے تحت میرا آدم کے سامنے سر بہ سجود ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن حکیم کے مطابق ابلیس نے استکبار کیا اور وہ کافروں میں شامل ہو گیا۔ اقبال اپنے ایک مضمون "Islam as a Moral and Political Ideal" میں ابلیس کے انکار کو اُس کی عزت نفس کا اظہار سمجھتے ہوئے لکھتے ہیں:

> " I hope I shall not be offending the reader when I say that I have a certain amount of admiration for the devil. By refusing to prostrate himself before Adam, whom he honestly believed to be his inferior, he revealed a high sense of self respect "

جہاں تک احادیث کا تعلق ہے ان کی رو سے ہر انسان کے ساتھ اس کا شیطان وابستہ ہے اور شیطان ہر انسان کے رگ و پے میں اور اس کی روح کی گہرائیوں میں خون کی طرح گردش کر رہا ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ ایک طرف خدا نے انسان سے اطاعت کرنے اور شیطان سے محفوظ رہنے کی تاکید یا تلقین کی تو دوسری طرف شیطان کو بھی پیدا کر کے اُسے آزادی عطا کی۔ شیطان ہر لمحہ انسان کو ورغلانے اور اس کی عاقبت کو بگاڑنے میں مصروف

کار رہتا ہے۔ اقبال کے ذہن میں اس نوع کے سوالات پیدا ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ "جاوید نامہ" میں شاہ ہمدان سے حیات وموت کے اسرار اقوام عالم کے عروج وزوال کے اسباب کے علاوہ حقیقت خیر وشر کے متعلق بھی دریافت کرتے ہیں۔

از تو خواہم سر یزدان را کلید — طاعت از ما جست و شیطان آفرید
زشت و ناخوش را چنان آراستن — در عمل از ما نکوئی خواستن
از تو پرسم این فسوں سازی کہ چہ — با قمار بدنشین بازی کہ چہ
مشت خاک و این سپہر گرد گرد — خود بگو می زیبدش کارے کہ کرد
کار ما افکار ما آزار ما — دست با دندان گزیدن کار ما

شاہِ ہمدان جواب دیتے ہیں

بندۂ کز خویشتن دارد خبر — آفریند منفعت را از ضرر
بزم با دیو است آدم را وبال — رزم با دیو است آدم را جمال
خویش را بر اہرمن باید زدن — تو ہمہ تیغ آن ہمہ سنگ فسن
تیز تر شو تافتد ضرب تو سخت — ورنہ باشی در دو گیتی تیرہ بخت

خدا کے نزدیک شیطان کو پیدا کرنے کا مقصود یہ ہے کہ انسان اس کا مقابلہ کرکے اور اس سے برسر پیکار ہو کر اپنی خودی کو مستحکم کر سکے۔ زندگی رزم گاہ خیر وشر کا نام ہے۔ اگر نفس کے اندر پیکار نہ ہو تو نفس کی ترقی ممکن نہیں۔ اقبال کی شاعری میں جہاں تک تصور ابلیس کا تعلق ہے۔ اس کے بالاستیعاب مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کہیں بھی ابلیس کو راندۂ درگاہ قرار نہیں دیا ہے بلکہ اس کے کردار کو انہوں نے اپنے مخصوص اور منفرد انداز نظر سے دیکھا ہے۔ ان کے یہاں ابلیس توحید اور عزتِ نفس کی ایک بڑی علامت ہے جس نے حکم ایزدی کے باوجود غیر خدا کے سامنے سجدہ ریز ہونے سے صاف انکار کیا۔ اقبال کو ابلیس کے کردار سے ایک طرح کی ہمدردی ہے۔ یہ ابلیس ہی ہے جس نے انسان کو اختیار کی نعمت عطا کی۔ کیونکہ آدم جب تک جنت میں تھا۔ وہ اختیار کی دولت سے بے بہرہ یا

محروم تھا۔ ابلیس نے آدم کو بہکا کر نافرمانی پر آمادہ کیا جس کے نتیجے میں اُسے جنت سے نکال کر زمین پر اُتارا گیا۔ اس زمین پر اُتر کر اُسے اختیار کی زندگی کرنے کا سلیقہ آیا۔ اقبال ابلیس کے یہاں عمل کی پختگی اور انہماک سے بے حد متاثر ہیں۔ اُن کے کلام میں ایسی کئی نظمیں ہیں جن میں ابلیس کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مثال کے طور پر جبریل و ابلیس، ابلیس کی عرضداشت، ابلیس کی مجلس شوریٰ، ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام، اغوائے آدم، تسخیر فطرت وغیرہ وغیرہ۔ ان نظموں کے علاوہ ان کی فارسی تصنیف ''جاوید نامہ'' میں بھی اس موضوع پر دو عنوانات ملتے ہیں۔ پہلا عنوان نمودار شدن خواجۂ اہل فراق ابلیس اور دوسرا نالۂ ابلیس۔ اس مقالے میں مذکورہ نظموں سے قطع نظر کر کے فقط ''جاوید نامہ'' کی روشنی میں اقبال کا تصور ابلیس پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ جاوید نامہ اکثر و بیشتر ناقدین کی نظر میں اقبال کے شاعرانہ کمال کی معراج اور ان کے تصور فن کا منتہا ہے۔ بقول اقبال ؎

آنچہ گفتم از جہاں دیگر است　　ایں کتاب از آسمان دیگر است

''جاوید جامہ'' افلاک کی سیر پر مشتمل ہے اس تصنیف میں افلاک کی سیر کے دوران اقبال کی ملاقات ہر اس انسان سے ہوتی ہے جو کسی نہ کسی غیر معمولی صفت کا مالک تھا خواہ اس کی نوعیت علوی ہو خواہ سفلی۔ افلاک کی سیر کرتے کرتے فلک مشتری کی منزل پر پہنچ کر اقبال کی ملاقات حلاّج، غالبؔ اور قرۃ العین طاہرہ کی ارواح جلیلہ سے ہوتی ہے۔ ان سے خودی کے موضوع اور حیات کے اسرار و رموز پر تبادلہ خیالات ہوتا ہے۔ اتنے میں، خواجۂ اہل فراق ابلیس، نمودار ہوتا ہے خواجۂ اہل فراق یعنی اُن تمام لوگوں کا سردار جنہوں نے خدا کی نافرمانی کر کے ہمیشہ کے لئے خدا سے دوری مول لی۔ یہاں پر ابلیس کا تعارف اقبال نے خود اپنی زبان سے نہیں بلکہ اپنے پیر و مرشد مولانا رومیؒ کی زبانی کرایا ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ ابلیس کی شخصیت اقبال کی نظر میں کوئی ایسی غیر معمولی شخصیت ضرور ہے جس کے تعارف کے لئے انہوں نے مولانا روم کا انتخاب کیا ہے۔ مذکورہ عنوان کے تحت اقبال ایک

تاریک منظر پیش کرتے ہیں جس کی رُو سے اچانک ہر سو تاریکی چھا جاتی ہے اور ایسے میں ایک شعلہ بھڑکتا ہے جس میں سے سرمئی قبا پہنے ہوئے ایک پیر مرد جو سر تا پا دھوئیں میں لپٹا ہوا ہے، نمودار ہو جاتا ہے۔ ابلیس کے تعارف میں جاوید نامہ کے یہ اشعار ملاحظہ کیجئے:

کہنۂ کم خندۂ اندک سخن　　چشم او بینندۂ جان در بدن
رند و ملا و حکیم و خرقہ پوش　　در عمل چون زاہدان سخت کوش
فطرتش بیگانۂ ذوق وصال　　زہد اُو ترک جمال لایزال
تا گسستن از جمال آسان نبود　　کار پیش افگند از ترک سجود
اند کے در واردات اُونگر　　مشکلات اُو ثبات اُونگر
غرق اندر رزم خیر و شر ہنوز　　صد پیمبر دیدہ و کافر ہنوز

تاریکی گمراہی کی علامت ہے اور تاریکی اس قہر کی بھی ایک علامت ہے جو ابلیس نے آدم کے تئیں ہمدری کے جذبے کے تحت اپنی جان پر لے لیا اور آدم پر بڑا احسان کیا۔ یہاں تاریکی میں سے شعلے کا نمودار ہونا اس بات کی طرف ایک واضح اشارہ ہے کہ ابلیس کو جب خدا نے آدم کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا تو اس نے سجدہ نہ کرنے کا یہ سبب بتایا کہ اس کی تخلیق آگ سے کی گئی ہے جب کہ آدم کو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے۔ بہر حال جب زندہ رود یعنی اقبال کو دیکھتا ہے تو وہ ایک لمبی آہ لے لیتا ہے اور اپنی ثابت قدمی اور استقامت کا ذکر کرتا ہے۔ ابلیس کہتا ہے کہ میں نے روز سرمستی کو خدا کی عدول حکمی کے بعد اُس سے اس کے بندوں کو گمراہ کرنے کی اجازت طلب کی اور اس نے مجھے اس کی اجازت دے دی۔ جب سے میں خدا کے ساتھ کئے گئے اس وعدے پر سختی سے کاربند ہوں اگرچہ میں نے اپنی طرف سے علماء کو کوئی کتاب نہیں دی پھر بھی۔

رشتۂ دین چون فقیہان کس نرشت　　کعبہ را کردند آخر خشت خشت
کیش ما را این چنین تاسیس نیست　　فرقہ اندر مذہب ابلیس نیست

دنیا کے تمام مذاہب میں گرچہ فرقے پائے جاتے ہیں لیکن ابلیس کا مذہب فرقہ

بندی سے مستثنیٰ ہے۔ مذہب ابلیس کا ایک واحد مسلک ہے اور وہ ہے خدا کی نافرمانی کرنا۔ ابلیس کہتا ہے کہ دنیا میں خیر و شر کی بحث میرے ہی دم سے ہے۔ اگر میں حکم خداوندی کا انکار نہ کرتا تو شر کا وجود ہی کہاں ہوتا۔ بال جبریل کی نظم ''جبریل و ابلیس'' میں جب جبریل ابلیس کو اس کی نافرمانی کا احساس دلاتے ہوئے کہتا ہے۔

کھودے انکار سے تو نے مقامات بلند　　چشم یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو

تو ابلیس بڑے ہی تفاخر سے طنطنے کے ساتھ جواب دیتا ہے۔

ہے مری جرأت سے مشت خاک میں ذوق نمو　　مرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پو!
دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزم خیر و شر　　کون طوفان کے طمانچے کھا رہا ہے میں کہ تو؟

اور پھر اس زندگی کی گہما گہمی اور ہنگامۂ حیات کو اپنی طرف منسوب کرتے ہوئے کہتا ہے۔

گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے　　قصۂ آدم کو رنگین کر گیا کس کا لہو؟

جاوید نامہ میں ابلیس کہتا ہے کہ میں نے وجود حق سے انکار ضرور کیا لیکن میری اصلیت کو دیکھ لے۔ میرے ظاہر پر نہ جا۔ میرے باطن کو دیکھ لے۔ میں نے ظاہری طور پر خدا کی ہستی سے انکار کر دیا ہے لیکن میں نے حقیقت میں انکار کے پردے میں اس کی ہستی کا اقرار کیا ہے۔ میرا انکار اقرار سے بہتر ہے کیونکہ مجھے آدم سے ہمدردی تھی۔ اس کے بعد ابلیس آدم کے تئیں ہمدردی کا اظہار کر کے اُسے مخلصانہ مشورہ دیتا ہے کہ تو میری قید سے رہائی حاصل کر لے اور اپنے ساتھ میرا نامۂ اعمال بھی تاریک نہ کر۔

در جہاں صیاد با نخچیر ہاست　　تا تو نخچیری بکیشم تیر ہاست
صاحب پرواز را افتاد نیست　　صید اگر زیرک شود صیاد نیست

اقبال کا نظریہ یہ ہے کہ انسان کی خودی ایسی ہونی چاہیے کہ وہ خدا کی ذات میں اس قدر ضم اور گم نہ ہو جائے کہ اس کا اپنا وجود ہی باقی نہ رہے۔ قطرہ سمندر میں مل کر اپنا وجود کھو بیٹھتا ہے اور سمندر کے ساتھ ایک ہو جاتا ہے جب کہ سیماب کا قطرہ اپنی انفرادیت اور اپنی خودی کو برقرار رکھتا ہے۔ اقبال کا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ زندگی جہد مسلسل کا نام ہے اور منزل کا

حصول شوق آرزو اور جستجو کی موت ہے۔ ابلیس ایک جگہ کہتا ہے۔

تو نہ شناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل چیست حیات دوام سوختن ناتمام

ابلیس کے نزدیک ساز زندگی سوز فراق پر موقوف ہے ؎

گفت ساز زندگی سوز فراق اے خوشا سرمستی روز فراق
برلبم از وصل می ناید سخن وصل اگر خواہم نہ او ماند نہ من
حرف وصل اُو را ز خود بیگانہ کرد تازہ شد اندر دل او سوز و درد

دوسری نظم کا عنوان ''نالۂ ابلیس'' ہے عام طور پر انسان شیطان سے پناہ مانگتا ہے لیکن ''نالۂ ابلیس'' میں ابلیس ہی انسان سے پناہ مانگتا ہے کیونکہ آدم کی صحبت نے اُسے خراب کر دیا ہے۔ دیکھئے ابلیس کس طرح نالہ کرتا ہے۔

اے خداوند صواب و ناصواب من شدم از صحبت آدم خراب
ہیچ گہ از حکم من سر بر نتافت چشم از خود بست و خود را در نیافت
خاکش از ذوق ابا بیگانہ از شرار کبریا بیگانہ
صید خود صیاد را گوید بگیر الامان از بندۂ فرمان پذیر

ان اشعار میں ابلیس آدم کی فرمانبرداری، خام فطرت اور کمزور ارادے کی دہائی دیکر خدا سے اپنی سابقہ اطاعت کا واسطہ دیکر کہتا ہے کہ اے خدا! مجھے ایسے کمزور آدم سے نجات دیدے۔ یہ کیسا صید ہے کہ خود بخود میرے دام میں اسیر ہو جاتا ہے۔ اگر تو نے مجھے اتنا طاقتور بنایا ہے تو مجھے ایک ایسا ہی قوی حریف عطا کر دیتے جس سے برسر پیکار ہو کر میں لطف اندوز ہو جاتا۔ یہ آدم تو مٹی کا ایک کھلونا ہے جب کہ میں مردِ پیر ہوں۔ کوئی مرد پیر مٹی کے کھلونوں سے کھیلے یہ اُسے ہرگز زیب نہیں دیتا۔ یہ آدم تو میرے سامنے مٹھی بھر خس رہ گیا ہے جس کو جلانے کے لئے بس ایک ہی شرارہ کافی ہے۔ تو نے مجھے آگ سے خلق کیا ہے میرے اندر جو عالم سوز آگ ہے اس کا تو کوئی مصرف ہی نظر نہیں آتا۔ اے خدا! مجھے ایک ایسا حریف عطا کر جو مجھے شکست دے سکے اور جس کی ایک ہی نگاہ سے میں لرزہ براندام

ہوجاؤں۔

بندۂ باید کہ پیچد گردنم　　لرزہ اندازد نگاہش در تنم
آن کہ گوید از حضور من برو　　آن کہ پیش او نیر زم بادوجو
اے خدا یک زندہ مردِ حق پرست　　لذتے شاید کہ یابم در شکست

دراصل علامہ اقبال نے انسان کی کمزور فطرت، پست ہمتی اور پست ارادے کے پیش نظر اُسے آئینہ دکھانے کے لئے ابلیس کے کردار کو آلۂ کار بنایا ہے۔ اقبال نے اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے لئے کبھی بلواسطہ پیرایہ بیان اختیار کیا ہے۔ انہوں نے جس ماحول میں پرورش و پرداخت پائی اور پھر اُن کے ذہن میں رسولؐ اور صحابہ کرام کی سیرت کے نقوش موجود تھے جن کے پیش نظر انہوں نے انسان کے متعلق جو نصب العین قائم کیا تھا اس پر جب وہ پورا یا کھرا نہ پایا گیا تو ظاہر ہے ان کے ذہن میں اس کے خلاف ایک قسم کا خاموش غم و غصہ یا ردعمل پیدا ہوا جس کا اظہار وہ رہ رہ کر اپنے کلام میں کرتے رہے۔ ''جواب شکوہ'' میں وہ مسلمان کی خامیوں اور خرابیوں کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ انسان کے متعلق اُن کے یہ خیالات ملاحظہ کیجئے

یہی انسان ہے سلطان بحر و بر کا　　کہوں کیا ماجرا اس بے بصر کا
نہ خود بیں نے خدا بیں نے جہاں بیں　　یہی شہ کار ہے تیرے ہنر کا

اقبال یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ جس قوم کو پیغمبر زندہ نہیں کر سکے اسے میری شاعری کیونکر بیدار کر سکتی ہے۔ ''نالۂ ابلیس'' کا مطالعہ کرنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابلیس آدم کے متعلق جن خیالات کا اظہار کرتا ہے وہ اقبال کے اپنے خیالات ہیں اور یہ خیالات اُن کے نصب العین کی بلندی کی وجہ سے ظاہر ہوئے ہیں۔

اقبال اور قرآنی تلمیحات

تخلیق اور ترسیلی عمل ایک مبہم اور دائرہ در دائرہ عمل ہے۔ لاشعور سے شعور کی طرف پیش قدمی اور مبہم تصورات سے لفظ، آواز یا رنگ کی طرف پیش قدمی ایک انتہائی مشکل عمل ہے۔ ذہن تصورات اور ترسیل یعنی رنگ، الفاظ اور عملی ارتکاز کے بغیر بے معنی بن جاتا ہے۔ ارتکاز ہی ترسیل کی دوسری صورت ہے یہی نقطۂ اظہار بھی ہے اور اظہار ہی اثباتِ ذات ہے۔ تخلیقی عمل تجربات کو ایک ارتکاز عطا کرتا ہے کیونکہ تخلیقی عمل اور ترسیل جملہ انسانی بنیادوں اور انسانی ذہن میں چھپے ہوئے منتشر تصوّرات کو ایک مربوط شکل عطا کرنے کا نام ہے اور تخلیقی عمل میں تصورات ایک مرکز پر جمع ہوتے ہیں۔ فنکار کسی خیال کی بہترین صورت گری کے لئے اپنی ہر کوشش کو بروئے کار لا کر اُسے صفحہ قرطاس پر تحریری شکل عطا کرتا ہے۔ چنانچہ اُس کے یہاں تخلیقی عمل کے پہلو پہلو اُس کا تنقیدی شعور بھی کارفرما رہتا ہے۔ شعر میں الفاظ سائنسی زبان کی طرح صرف معلومات کی کنجی کے طور پر استعمال نہیں ہوتے بلکہ شعر میں الفاظ کا اظہار تخلیقی ہوتا ہے۔ شاعر کسی خیال کو مکمل اور جامع بنانے کے لئے جس جگر کاوی سے کام لیتا ہے، اُس کا انداز بقول اقبال عام لوگ نہیں لگا سکتے۔ اُن کے سامنے شعر بنا بنایا آتا ہے۔ وہ اُس روحانی اور لطیف کرب سے آشنا نہیں ہو سکتے جس نے الفاظ کی ترتیب پیدا کی ہے۔ جہاں اچھا شعر دیکھو، سمجھ لو کوئی نہ کوئی مسیح مصلوب ہوا ہے۔ اچھے شعر کا پیدا کرنا اوروں کے لئے کفّارہ ہونا ہے"[1]۔

شعر کی دنیا میں خیالات کی ترسیل اور ابلاغ کے لئے فنکار مختلف پیرائے سے کام لیتا ہے۔ بعض اوقات اُسے طویل قصّوں سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔ چونکہ شعر میں طویل قصوں

۱۔ محمد عبداللہ قریشی، مکاتیب اقبال بنام گرامی، ص ۱۵۵۔

کے بیان کی مطلق گنجائش نہیں اس لئے شاعران قصوں کی طرف تلمیحی اشاروں سے کام لیکر اپنے ماضی الضمیر کو ادا کرنے پر اکتفا کرتا ہے۔ تلمیح کیا ہے؟ اس کی تشریح کرنے سے پہلے علامہ اقبال اور قرآن کے موضوع کے تعلق سے کچھ کہنا ناگزیر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اقبال کے کلام کی تفہیم میں، قرآن کے مطالعے کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اُن کے شخصی عناصر کی تعمیر و تشکیل میں عشق رسولؐ کے پہلو بہ پہلو قرآن حکیم کا نہایت اہم رول رہا ہے۔ اپنے خطبات ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' میں ایک جگہ صوفیائے اسلام میں ایک بزرگ کا قول رقم کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ''جب تک مومن کے دل پر بھی کتاب (قرآن کریم) کا نزول ویسا ہی نہ ہو جائے جیسا کہ آنحضرتؐ پر ہوا تھا، اس کا سمجھنا محال ہے''۔ بال جبرئیل میں ایک جگہ اسی قول کو نظم کیا گیا ہے۔

ترے ضمیر پر جب تک نہ ہو نزول کتاب گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

اسلام کی تعلیمات کا سرچشمہ قرآن مجید ہے اور نفسِ اسلام قرآن مجید میں بکمال و تمام آچکا ہے۔ قرآن مجید سے علامہ کے والہانہ شغف کی کئی مثالیں اقبال پر کام کرنے والوں نے رہ رہ کر پیش کی ہیں۔ جن کی رُو سے علامہ خاص دلسوزی اور سوز و گداز کے ساتھ قرآن کریم کی تلاوت کیا کرتے۔ اس دوران اُن کے یہاں آنسوؤں کا تار بندھ جاتا اور اُن پر لرزش و استہزاز کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ پھر کتاب عزیز کے اوراق کو دھوپ میں رکھ کر سکھایا جاتا۔ علامہ نے اپنے پیام میں قرآن کو کثرت سے پڑھنے اور اس سے نورِ ہدایت حاصل کرنے پر خاصا زور صرف کیا ہے۔ اُنہیں قومی انحطاط پر شدید کڑھن محسوس ہوتی تھی کہ قوم نے قرآن کی نعمت سے صحیح فائدہ حاصل نہیں کیا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''حدیث میں آیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اسے دین کی سمجھ عطا کرتا ہے۔ افسوس کہ مسلمان مردہ ہیں۔ انحطاط ملّی نے ان کے تمام قویٰ کو شل کر دیا ہے اور انحطاط کا سب سے بڑا جادو یہ ہے کہ یہ اپنے صید پر ایسا اثر ڈالتا ہے جس سے انحطاط کا مسحور اپنے

قاتل کو اپنا مربی تصور کرنے لگ جاتا ہے۔ یہی حال اس وقت مسلمانوں کا ہے۔"

علامہ اقبال انحطاط ملّی کو دیکھ کر جب ملت اسلامیہ کی مردہ رگوں میں زندگی کا خون دوڑا کر اسے تحرّک اور حرارت بخشتے ہیں تو اس حیات بخش پیغام کو مسلمانوں تک پہنچانے کے لئے قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ چنانچہ گزشتہ قوموں کی تاریخ سے مختلف مثالیں دیکر راہِ ہدایت واضح کرتے ہیں اور قوموں کے عروج وزوال کی نشاندہی کر کے اُن کے عروج کے اسباب اور اُن کے زوال کی وجوہ بیان کرتے ہیں۔ وہ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ اگر وہ زندہ رہنا چاہتے ہیں تو اُنہیں قرآنی نظام کو اپنانا ہوگا۔ اُن کے نزدیک قرآن مسلمانوں کے لئے ایک آئین کی حیثیت رکھتا ہے اور اگر یہ آئین ہاتھ سے جاتا رہے تو ملت تباہ ہو جاتی ہے۔

زیرِ نظر مقالے میں اقبال کی چند قرآنی تلمیحات کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اقبال کی قرآنی تلمیحات کا تجزیہ کرنے سے پیشتر تلمیح کو سمجھنا ضروری ہے۔ تلمیح کیا ہے؟ کسی قصہ طلب واقعہ سے مضمون پیدا کرنا ایک صنعت ہے جس کے ذریعے سے ایک بڑے سے بڑا مضمون نہایت مختصر لفظوں میں ادا ہو جاتا ہے۔ بحر الفصاحت کے مولف نجم الغنی رامپوری تلمیح کے سلسلہ میں یوں رقمطراز ہیں:

"شاعر اپنے کلام میں کسی مسئلہ مشہورہ کسی قصے یا مثل شائع یا اصلاح نجوم، وغیرہ ایسی بات کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کے بغیر معلوم ہوئے اور بے سمجھے اُس کلام کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں نہ آئے۔"[1]

یعنی شاعر جب کسی مشہور قصے کی طرف چند لفظوں کے ذریعے اشارہ کرتا ہے تو اُسے تلمیح کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر آتش کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے۔

عاشق اُس غیرتِ بلقیس کا ہوں میں آتش بام تک جس کے کبھی، مرغِ سلیمان نہ گیا

۱۔ بحر الفصاحت۔ (مولف۔ نجم الغنی رامپوری)۔

اس شعر میں قصہ بلقیس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو قرآن میں مفصل طور مذکور ہے۔ ہُدہُد کا خبر دینا اور حضرت سلیمان کا خط بلقیس والیہ ملک سبا تک پہنچانا اور پھر بلقیس کا حاضر ہونا۔ اس تاریخی اور مذہبی واقعے کو فن کاروں نے مختلف معانی اور جہتوں سے ایک اساطیری حیثیت عطا کی ہے۔

اُردو شاعری میں شروع سے تشبیہات اور استعارات کے ساتھ ساتھ تلمیحات کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔ تلمیحات کا یہ وافر ذخیرہ مختلف تہذیبی، تمدنی اور تاریخی عناصر پر مشتمل ہے۔ فراقؔ گورکھپوری نے اُردو شاعری میں ہندوستانیت داخل کرنے کی غرض سے جو اجتہاد شروع کیا اُس میں ملکی تلمیحات کو بھی داخل کرنے کا شعوری عمل کارفرما تھا۔ فراقؔ کے اجتہاد کو ڈاکٹر سلام سندیلوی نے اپنے مجموعۂ رباعیات ''شام و شفق'' میں اور آگے بڑھایا۔ اُنہوں نے مذکورہ مجموعے کو ملکی اور غیر ملکی تلمیحات کے عنوان سے دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ان شعراء کے اس اجتہادی عمل میں اگرچہ بعض خامیاں بھی در آئی ہیں۔ تاہم ان کی اردو دوستی اور ادبی خدمات کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

علامہ اقبال کے یہاں جہاں تک تلمیحات کے برتاؤ کا تعلق ہے۔ اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ اُن کی پرداخت مذہب اسلام اور اس کی مقدس روایات کے زیر سایہ ہوئی تھی۔ اس لئے رفتہ رفتہ اُن کے کلام میں یہی عناصر نمو پا کر پروان چڑھنے لگے۔ اقبال نے عام و متداول شاعرانہ تلمیحات کے ساتھ ساتھ قرآنی تلمیحات کا بھی کثرت سے استعمال کیا ہے۔ قرآنی تلمیحات کا زیادہ تر استعمال اُن کے فارسی کلام میں ملتا ہے۔ اُن کی برتی ہوئی تلمیحات اُن کے فلسفیانہ مقاصد سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ اُن کا فلسفۂ خودی صوفیائے کرام اور قرآن کریم سے ماخوذ ہے ؎

پیکر ہستی زِ آثار خودی است ہر چہ می بینی ز اسرار خودی است

قرآن کریم کی یہ آیت استحکام خودی پر دال ہے۔

یا ایھا الذین اٰمنو علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا

اهتديتم الى الله مرجعكم جميعاً فينبئكم بما كنتم تعملون۔
یعنی اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تم پر فرض ہے خودی کی محافظت۔ اگر تم ہدایت پر ہو تو وہ شخص جو گمراہ ہے تمہیں کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا۔ تم سبھوں کو اللہ ہی کے پاس واپس جانا ہے اور وہ تمہیں تمہارے اعمال پر مطلع کر دے گا۔ (تا کہ ان کے مطابق جزا و سزا مل سکے)

خویشتن را چوں خودی بیدار کرد　　آشکارا عالم پندار کرد
صد جہاں پوشیدہ اندر ذات اُو　　غیر او پیداست از اثبات اُو
می کشد از قوت بازوئے خویش　　تا شود آگاہ از نیروے خویش
خود فریبی ہائے او عین حیات　　ہمچو گل از خون و ضو عین حیات

اقبال نے تلمیحات کے سلسلہ میں حضرت یوسفؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت سلیمانؑ جیسے پیغمبروں کی سیرت سے کافی مواد اخذ کیا ہے۔ قرآن میں ان پیغمبروں کے متعلق مختلف واقعات کا ذکر مفصل آیا ہے۔ اقبال نے حضرت یوسفؑ کے فروخت کئے جانے، حضرت موسیٰؑ کی طرف سے اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہونے کی خواہش ظاہر کرنے، قوتِ کلیمیؑ کے سامنے فرعون جیسی طاغوتی اور استبدادی قوتوں کے شکست کھا جانے، خدائے برتر کی وحدانیت کے سلسلہ میں حضرت ابراہیمؑ کے تجرباتی واقعے سے گزرنے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے کی گئی آزمائش پر پورا اُترنے، رسول اللہؐ کے شق القمر کے واقعے، ابلیس کے استکبار کے نتیجے میں اس کا خدا کے نافرمانوں میں شامل ہونے، حضرت موسیٰؑ کے حضرت خضرؑ کے ہمراہ حصول علم کے لئے چل کر عجیب قسم کے واقعات سے دوچار ہونے اور اسی نوعیت کے قرآن کریم میں مفصل طور بیان کئے گئے متعدد واقعات کو تلمیحات کی شکل میں کمال فنکاری کے ساتھ برتا ہے ؎

عصرِ من دانندۂ اسرارِ نیست　　یوسف من بہر ایں بازار نیست
لن ترانی نکتہ ہا دارد دقیق　　اندکے گم شو دریں بحرِ عمیق

مردِ حر محکم زوردِ لاتخف | مابمیدان سر بجیب و سر بکف
یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی | سکھائے کس نے اسمٰعیلؑ کو آدابِ فرزندی
آگ ہے اولادِ ابراہیمؑ ہے نمرود ہے | کیا کسی کو پھر کسی کا امتحان مقصود ہے
آنکہ مہتاب از سرِ انگشتش دونیم | رحمتِ او عام اخلاقش عظیم
کشتیٔ مسکین و جان پاک و دیوارِ یتیم | علم موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش

اقبال کی برتی ہوئی تلمیحات مختلف الجہت اور کثیر المعانی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اقبال کی تلمیحات پر اب تک جو بھی کام ہوا ہے اُس میں اقبال کی تلمیحات کو فقط اشاراتی نشاندہی تک ہی محدود رکھا گیا ہے جبکہ تلمیحات اقبال کی مختلف تاویلیں ہوسکتی ہیں۔ ذیل میں جن تلمیحات کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہ اس طرح ہیں۔

۱۔ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کا واقعہ۔
۲۔ حضرت ابراہیمؑ کا اپنی قوم کے بتوں کا توڑنا۔
۳۔ حضرت ابراہیمؑ کا آگ سے بچایا جانا۔
۴۔ حضرت ابراہیمؑ کے یہاں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے احساس کے سلسلہ میں کئی تجربات سے ہوکر گزرنا اور پھر غیر اللہ سے ہٹ کر فقط خدائے واحد کے سامنے سربسجود ہونا۔
۵۔ غارِ ثور کا واقعہ۔
۶۔ ابلیس کی نافرمانی۔
۷۔ آیۂ ان الملوک
۸۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کا واقعہ، وغیرہ وغیرہ۔

یوں تو اس واقعے سے سبھی واقف ہیں کہ حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کے واقعے سے صبر وایثار اور اطاعت کی ایک نمایاں مثال قائم ہوتی ہے۔ حضرت اسمٰعیلؑ نے اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لئے اپنے والد حضرت ابراہیمؑ کے سامنے قربانی کے لئے گردن جھکا دی تھی۔

اللہ اللہ ہائے بسم اللہ پدر | معنی ذبحِ عظیم آمد پسر

جب حضرت ابراہیمؑ کو ندا آئی کہ اے ابراہیمؑ تو نے خواب سچ کر دکھایا۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ یقیناً یہ ایک کھلی آزمائش تھی۔ قرآن کے سورہ الصّٰفّٰت کی آیت نمبر ۱۰۷ میں درج ہے۔ ''اور ہم نے ایک بڑی قربانی فدیے میں دیکر اس بچے کو چھڑا لیا۔'' جب ہم اس واقعے کا تجزیہ کرتے ہیں تو اس کی کئی جہتیں ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ اوّل یہ کہ حضرت ابراہیمؑ کا مختلف مراحل سے گزر کر مذہبی مرحلے پر آجانا۔ یہ عزیمت اور رخصت کے درمیان ایک زبردست معرکہ ہے۔ دوسرے یہ اُس کے وجود کے ساتھ غیر مشروط سپردگی ہے، جو خود اس کے وجود کی بنیاد ہے۔ تیسرے یہ کہ ہم اسے ایک وجودی اور بحرانی مسئلے یا فیصلے سے تعبیر کر سکتے ہیں، کیونکہ اسی فیصلے سے اُس کا وجود معتبر بن جاتا ہے۔ ورنہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ دونوں باپ بیٹے اس سے رجعت بھی کر سکتے تھے۔ مگر رجعت کی صورت میں اُن کے وجود کے غیر معتبر ہونے کا احتمال تھا۔ حضرت اسمٰعیلؑ کا فیصلہ بھی اسی نوعیت کا ہے۔ اس کے فیصلے میں خود سپردگی کا جذبہ کارفرما ہے۔ اور یہ عام اخلاقیات اور عام فکر کی نہج سے ہٹ کر شہادت کا درجہ حاصل کرنے کا فیصلہ ہے۔ یہ وہ فیصلہ ہے جس میں شیطان کئی مرتبہ سامنے آکر حضرت اسمٰعیلؑ کو گمراہ کرنے اور اُنہیں اپنے فیصلے سے پیچھے ہٹائے جانے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔ شیطان ایک ایسا غیر معتبر وجود ہے جو ہمیشہ انسان کے ساتھ رہ کر اُسے ہر وقت خیر کے راستے سے ہٹانے کی کوشش میں مصروف کار رہتا ہے۔ مگر حضرت اسمٰعیلؑ درمیان میں حائل تمام عناصر سے برسرِ پیکار ہو کر اور اُنہیں مسترد کر کے ایک معتبر وجودی فیصلے کا سامان کرتے ہیں

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی سکھائے کس نے اسمٰعیل کو آدابِ فرزندی

حضرت ابراہیمؑ کا اپنی قوم کے بتوں کو توڑنے کا جو واقعہ قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے اُس کی رُو سے حضرت ابراہیمؑ خدا کی وحدانیت کو تسلیم کرتے ہیں اور اُس کے کلی وجود کے سامنے سربسجود ہونے کی تلقین کر کے اپنی قوم کے مشرکانہ رویے سے ہٹ کر خدا کی وحدانیت کا اعلان کرنے کے لئے ایک مخصوص اور منفرد راستہ اختیار کرتے ہیں۔ جبکہ

حضرت ابراہیمؑ کی قوم کے تصورات اور اُن کا اندازِ فکر اُن سے قطعی مختلف تھا کیونکہ حضرت ابراہیمؑ کی قوم بُت پرست تھی۔ حضرت ابراہیمؑ کا اپنی قوم کے بتوں کو توڑنے کے سلسلے میں قرآن میں درج ہے۔ یہاں ترجمہ پیش کیا جارہا ہے۔

"اور نوح ہی کے طریقے پر چلنے والا ابراہیمؑ تھا۔ جب وہ اپنے رب کے حضور قلب سلیم لے کر آیا جب اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا۔ یہ کیا چیزیں ہیں جن کی تم عبادت کرتے ہو۔ کیا اللہ کو چھوڑ کر جھوٹ کے گھڑے ہوئے معبود چاہتے ہو۔ آخر رب العالمین کے بارے میں تمہارا کیا گمان ہے۔ پھر اُس نے تاروں پر ایک نگاہ ڈالی اور کہا۔ میری طبیعت خراب ہے۔ چنانچہ وہ لوگ اُسے چھوڑ کر چلے گئے۔ ان کے پیچھے وہ چپکے سے اُن کے معبودوں کے مندر میں گھس گیا اور بولا۔ آپ لوگ کھاتے کیوں نہیں ہیں۔ آپ لوگ بولتے بھی نہیں۔ اس کے بعد وہ ان پر پل پڑا۔ اور سیدھے ہاتھ سے خوب ضربیں لگائیں۔ (واپس آکر) وہ لوگ بھاگے بھاگے اُس کے پاس آئے۔ اُس نے کہا۔ تم اپنی ہی تراشی ہوئی چیزوں کو پوجتے ہو، حالانکہ اللہ ہی نے تم کو بھی پیدا کیا ہے اور ان چیزوں کو بھی جنہیں تم پوجتے ہو"۔

نارِ نمرود کے مشہور واقعے کے مطابق حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالا گیا تھا۔ مگر حضرت ابراہیمؑ نے نہایت جرأت اور استقلال کے ساتھ اس آزمائش کا خیر مقدم کیا۔ حضرت ابراہیمؑ کا آگ سے بچائے جانے کی جو تلمیح ہے وہ دو بڑی جہتوں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ نمبر ایک معتبر وجود کے حامل لوگوں کو نامعتبر وجود کس طرح کچل دیتے ہیں۔ اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کا آگ میں کودنے کا جو واقعہ ہے۔ وہ معتبر وجود کے سامنے ایک خود سپردگی ہے۔ یہ اس بات کی طرف واضح اشارہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے بار بار جبرئیل کی گذارش پر کان نہ دھر کر مسترد کر کے رضائے الٰہی کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا۔ حضرت ابراہیمؑ کو جب

آگ میں ڈالا گیا تو آگ نے اُنہیں بالکل نہیں جلایا۔ عام حالات میں تو آگ جلانے کا کام کرتی ہے مگر نارِ نمرود کا واقعہ ایک استثنیٰ ہے۔ نارِ نمرود کے سلسلہ میں ایک اور مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ آگ میں پڑنے کے بعد حضرت ابراہیمؑ کتنی دیر تک آگ میں پڑے رہے۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت جبرئیل کے درمیان جو مکالمات ہوئے اُنہیں اگر Serial Time یعنی زمان متسلسل کی ذیل میں دیکھا جائے تو یہ سلسلہ بہت طویل ہو جاتا ہے۔ مگر قرآن میں اس کے متعلق جو تصویر ہمارے سامنے آتی ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف چند لمحات کا معاملہ ہے۔ معراج کا واقعہ بھی چند لمحات کا معاملہ ہے۔ اس کی ایک اور جہت جو پیدا ہوتی ہے اُس کی رُو سے ہم اسے ایک ایسے لازوال تجربے سے تعبیر کر سکتے ہیں جو حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالے جانے کے وقت اور آگ میں پڑنے کے بعد ہوا۔ تجربہ کی نوعیت کا مسئلہ یہاں بڑی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ ظاہر ہے یہ تجربہ عارفانہ نہیں بلکہ ایک پیغمبرانہ تجربہ ہے۔ یہ تجربہ عام انسانی تجربے سے یکسر مختلف ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ آگ سے حضرت ابراہیمؑ کی بسلامت واپسی بنی نوع انسان کے لئے گہرے یاسی وجودی اور مذہبی معنی سے عبارت ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کا تلاشِ حق میں مختلف مرحلوں سے گزرنا اس امر کی طرف ایک واضح اشارہ ہے کہ وہ روحانی ترقی کے مراحل طے کر رہے ہیں۔ یعنی پہلے تاریکی میں جب وہ ایک ستارے کو دیکھتے ہیں۔ تو اُسے اپنا رب تصور کرنے لگتے ہیں۔ مگر اس کے غروب ہو جانے کے ساتھ ہی وہ کہہ اُٹھتے ہیں۔ کہ میں غروب ہو جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اس کے بعد جب وہ چمکتے ہوئے چاند کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ تو اسے اپنا رب مان لیتے ہیں۔ مگر چاند بھی جب غروب ہو جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ میرا رب نہیں ہو سکتا۔ پھر جب تاریکی سے نکل کر روشنی میں آ کر چمکتے ہوئے سورج پر اُن کی نظر پڑتی ہے تو اُنہیں یہ گمان ہوتا ہے کہ یہی میرا رب ہے، مگر سورج کے غروب ہو جانے پر حضرت ابراہیمؑ اپنی قوم سے کہتے ہیں کہ بے شک میں تمہارے شرک سے بیزار ہوں۔ حضرت ابراہیمؑ تلاشِ حق میں یکے بعد دیگرے کئی تجربوں سے ہو کر

گزرتے ہیں۔ مگر آخرکار جب ستارہ، چاند اور سورج فطرت کے یہ تینوں مظاہر طلوع ہو کر غروب ہو جاتے ہیں تو حضرت ابراہیمؑ کو احساس ہو جاتا ہے کہ فطرت کے ان مظاہر بلکہ پوری کائنات کے نظام کو چلانے والا کوئی قادر مطلق ہے۔ چنانچہ وہ بعد میں یکسو ہو کر اپنا رُخ اُس کی طرف کر لیتے ہیں جو ارض و سماوات کا خالق و مالک ہے۔ قرآن مجید کے سورۂ انعام کی آیت نمبر ۷۹ میں فرمایا گیا ہے۔ انی وجهت وجهی للذی فطر السّماوات والارض حنیفا وما انا من المشرکین۔ اقبال کے ان اشعار کو اسی تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔

وہ سکوتِ شامِ صحرا میں غروبِ آفتاب جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بینِ خلیلؑ
جہاں یکسر مقامِ آفلین است دریں غربت سرا عرفان ہمیں است

قرآن مجید کی سورۃ التوبہ کی آیت سولہ کے مطابق جب کفارِ مکّہ نے حضورؐ کو قتل کرنے کا تہیہ کر لیا تو حضورؐ عین اُسی رات جو اِن کے قتل کے لئے مقرر کی گئی تھی۔ اپنے ایک رفیق حضرت ابوبکر صدیقؓ کو ساتھ لیکر مکّہ سے نکلے۔ آپؐ نے مدینہ کی راہ چھوڑ کر جنوب کی راہ اختیار کر لی۔ یہاں تین دن تک آپؐ غارِ ثور میں چھپے رہے۔ خون کے پیاسے آپؐ کے دشمن آپؐ کو ہر سُو تلاش کرتے رہے۔ اطراف مکّہ کا کونہ کونہ چھان مارا۔ اس سلسلہ میں ایک مرتبہ اُن کے دشمن عین اُس غار کے دہانے پر بھی پہنچ گئے جس میں آپؐ چھپے ہوئے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو سخت خوف لاحق ہوا کہ اگر ان لوگوں میں سے کسی نے ذرا آگے بڑھ کر جھانک لیا تو وہ ہمیں دیکھ لے گا۔ لیکن نبیؐ کے اطمینان میں فرق نہ آیا۔ اور آپؐ نے یہ کہہ کر حضرت ابوبکرؓ کو تسکین دی کہ غم نہ کرو۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

اے کہ در زندانِ غم باشی اسیر از نبیؐ تعلیم لا تحزن بگیر
ایں سبق صدیقؓ را صدیقؓ کرد سرخوش از پیمانہ تحقیق کرد

سورۃ بقرہ کی آیت نمبر ۳۴ میں ابلیس کے استکبار اور اس کے اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کے نتیجہ میں اُسے کافروں میں شامل کئے جانے کا واقعہ اس طرح آیا ہے۔

و اذ قلنا للملٰئِکۃِ السجدو لآدم فسجدوالا ابلیس۔ ابیٰ
واستکبر و کان من الکٰفرین۔

ضربِ کلیم کی نظم بعنوان ''تقدیر'' میں ابلیس اپنی نافرمانی کو مشیت ایزدی پر محمول کر کے اپنی بے اختیاری کا رونا اس طرح رو رہا ہے ؎

حرفِ استکبار ترے سامنے ممکن نہ تھا ہاں مگر تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود

اقبال اپنی مشہور نظم ''خضر راہ'' کے ایک بند میں یورپی اقوام کے سامراجی نظام کا پول قرآن کی آیت ان الملوک سے کھولتے ہیں۔ علامہ کے نزدیک ملوکیت ایک قسم کی جادوگری ہے جو مغلوب اقوام سے اُن کا احساس خودی اور احساس آزادی چھین لیتی ہے۔ یہ اقبال کے یہاں زندگی کا اجتماعی شعور ہے جو اُنہیں سلطنت کے راز فاش کرنے کی طرف مائل کرتا ہے۔

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیۂ ان الملوک سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر پھر سلادیتی ہے اُس کو حکمراں کی ساحری

قرآن مجید کے سورۂ الکہف میں ایک جگہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کا ذکر آیا ہے۔ یہ شرط ہوئی کہ حضرت موسیٰؑ اُن کی کسی بات پر اعتراض نہ کریں گے۔ لیکن حضرت موسیٰؑ تین مرتبہ حضرت خضر کی باتوں پر معترض ہوئے۔

۱۔ جب کشتی میں سوراخ کیا جاتا ہے۔
۲۔ جب ایک بچہ کو قتل کر دیا جاتا ہے۔
۳۔ جب ایک دیوار کو سیدھا کر دیا جاتا ہے۔

حضرت خضرؑ نے ان واقعات کی توجیہہ کی اور فرمایا کہ کشتی میں اس لئے سوراخ کیا گیا کہ وہ ایک غریب آدمی کی تھی اور ایک بادشاہ کشتیوں کو زبردستی پکڑ لیتا تھا۔ اس لئے میں نے اسکو عیب دار کر دیا تا کہ وہ محفوظ رہے۔ بچے کو قتل کرنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے حضرت خضرؑ نے فرمایا کہ اس کے والدین مسلمان تھے اور مجھے خوف پیدا ہوا کہ کہیں وہ سرکشی اور کفر نہ اختیار کر لے۔ اور دیوار کو اس لئے سیدھا کر دیا گیا کہ وہ دو یتیم بچوں کی تھی

اوران کے نیچے ان کا خزانہ گڑا ہوا تھا۔ اس لئے خدا نے چاہا کہ وہ خزانہ محفوظ رہے اور وہ جوان ہو کر اس کو نکال لیں۔ اس توجیہہ کے بعد حضرت خضرؑ حضرت موسیٰؑ سے جدا ہوئے۔ قرآن مجید میں درج حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کے اس واقعہ کی روشنی میں اقبال کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے ؎

کشتیٔ مسکین و جان پاک و دیوار یتیم　　علم موسیٰؑ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش

اقبال نے اس شعر میں ایک طویل قصے کو جس فنکاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ اُنہیں کا کارنامہ ہے۔ اقبال کی برتی ہوئی تلمیحات کے پس پشت قوت و شوکت کا پیام کارفرما ہے۔ ان میں تحرک ہے، ان میں زندگی کی ہنگامہ آرائیوں سے نبرد آزما ہو کر سرفروش ہونے کی تعلیم ملتی ہے۔ علامہ نے شاعرانہ جوش میں یہاں تک کہہ دیا ہے ؎

وہ نبوت ہے مسلماں کے لئے برگِ حشیش　　جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام

اقبالؔ کی اُردو شاعری کا استعاراتی مطالعہ

تشبیہہ، استعارہ اور کنایہ علم بیان کے وہ اجزائے ترکیبی ہیں جنہیں کسی بھی سادہ بیان کو دل کش، مؤثر اور پہلودار بنانے کی غرض سے شعر میں بروئے کار لایا جاتا ہے۔ استعارہ کے لغوی معناں مستعار لینے کے ہیں۔ فرہنگ آصفیہ جلد اول کی رُو سے استعارہ کے معنی کسی چیز کا عاریتاً مانگنا ہے۔ انگریزی زبان میں استعارہ کے لئے Metaphor کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ Metaphor یونانی زبان سے ماخوذ ہے۔ یونانی لفظ جو استعارے کا ماخذ ہے، اس کے معناں Carry on کے ہیں۔ یعنی لے جانا یا آگے لے جانا۔ گویا استعارہ کسی لفظ کے معنوں کو اس کے لغوی مفہوم سے آگے لے جاتا ہے اور اس میں وسعت اور تنوع پیدا کرتا ہے۔ پس استعارہ ایک ایسا طریقہ ہے جو کئی چیزوں کو بیک وقت کہنے کے لئے معنوں کو وسعت دیتا ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان کے الفاظ میں ''شعر کی روح چونکہ رمز و ایماء کے طلسم میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ اس لئے لفظوں کے معنے میں تشبیہہ اور استعارے اور کنائے سے وسعت پیدا کی جاتی ہے۔''[1]

درس بلاغت میں استعارہ کے ضمن میں اس طرح لکھا ہے:

''استعارہ دراصل مجاز ہی کی ایک قسم ہے۔ جس میں لفظ اپنے لغوی معنی کو ترک کر کے لسانی سیاق و سباق کے اعتبار سے نئے معنی مستعار لیتا یا یوں کہیے کہ انہیں آگے بڑھاتا ہے اور اس طور پر زبان نئی وسعتوں سے آشنا ہوتی ہے۔''[2]

۱۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان، اردو غزل، ص ۱۶۰۔

۲۔ شمس الرحمان فاروقی، درس بلاغت، ص ۱۶۰۔

استعارے میں مشبہ اور مشبہ بہ ایک جان دو قالب بن جاتے ہیں۔ من تو شدم اور تو من شدی کی تفسیر بن جاتے ہیں۔ مولوی نجم الغنی رامپوری ''بحر الفصاحت'' میں استعارے کی نسبت لکھتے ہیں: ''استعارے میں مشبہ کو بعینہ مشبہ بہ ٹھہرا لیتے ہیں۔ یعنی بہادر کو بعینہ شیر سمجھ لیتے ہیں'' (بحر الفصاحت، ص ۸۱۱)۔ مثال کے طور پر کسی خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر کوئی یہ کہے کہ میں نے پھول جیسی لڑکی دیکھی تو ظاہر ہے تشبیہ ہوگی لیکن اگر یوں کہا جائے کہ میں نے پھول دیکھا تو اسے استعارہ نہیں کہیں گے۔

استعارے کی کئی قسمیں ہیں لیکن ان میں استعارہ بالتصرع، استعارہ بالکنایہ اور استعارہ تخیلیہ کی اہمیت زیادہ ہے۔ جامع اللغات کی رُو سے استعارہ بالتصرع میں مشبہ بعینہ مشبہ بہ قرار دیا جاتا ہے، اسی واسطے دونوں میں سے مشبہ بہ کا ذکر کرتے ہیں۔ جیسے صنم یا بُت کہیں اور معشوق مراد لیں اور جب مشبہ مذکور اور مشبہ بہ متروک ہو تو مشبہ کو استعارہ بالکنایہ کہتے ہیں۔ جیسے مصرع (ہمارے قتل کرنے کو نگاہِ یار کافی ہے) میں نگاہ کو تیر سے استعارہ کیا گیا ہے۔ یہاں نگاہ کا استعارہ بالکنایہ ہے۔ اسی طرح جب مشبہ بہ ترک کیا جائے تو جس قرینے سے وہ سمجھ میں آئے اسے استعارہ تخیلیہ کہتے ہیں۔ جیسے مصرعہ بالا میں نگاہ کو تیر سے استعارہ کیا ہے۔ جو مشبہ بہ ہے اور متروک ہے۔ قتل کرنا جو قرینہ ہے اس سے سمجھا جاتا ہے۔ قتل کرنا استعارہ تخیلیہ ہے۔''[1]

استعارہ کو الفاظ کے اُس دریچہ سے تعبیر کیا گیا ہے، جس کے ذریعے ہم معنویت کے گلستان کا نظارہ کرتے ہیں۔ نامعلوم تجربات کی دنیا کی سیر کرتے ہیں۔ استعارہ درونِ پردہ کی چیز ہے۔ یہ ادب میں ایکسرے کی شعاعوں کا کام کرتا ہے۔ اور معنویت کی اس دنیا سے روشناس کراتا ہے جو ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوتی ہے۔ استعارہ شاعر کے تخیل کی بلندی کا مظہر ہوتا ہے۔ شاعر کے تخیل میں جس قدر بلندی ہوگی اور وہ جس قدر ہمہ جہت ہوگا، اسی قدر اُس کے استعارات بھی جادو جگاتے ہیں۔ استعارہ سے شاعر کی ہنرمندی اور اس

۱۔ شمس الرحمان فاروقی، جامع اللغات، ص ۱۹۰۔

کے ادبی فکر کی سطح کا اندازہ ہوتا ہے۔ پروفیسر حامدی کاشمیری استعارہ کے ضمن میں اس طرح رقمطراز ہیں:

> ''استعارہ دو مختلف یا متضاد اشیاء یا تجربوں میں مماثل پہلوؤں کی وحدت پذیری کا عمل ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یہ تجربے کی تہہ داری کو اسیر کرنے کی لسانی ترکیب بھی ہے۔ اس لئے یہ کہنا درست ہوگا کہ استعارہ شعری زبان کی اصلیت اور ہمہ گیری کا تعین کرتا ہے۔ یہ محض مشابہتی پہلو سے متعلق نہیں ہوتا بلکہ اظہاریت کی امکانی حدود کو بھی پھلانگتا ہے۔ اور وسیع ترجہات پر محیط ہو جاتا ہے۔''[1]

شعر میں استعارے کے عمل، اس کے کردار یا تفاعل کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ استعارہ شعر میں برائے استعارہ کی حیثیت نہیں رکھتا۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں معانی کے کئی امکانات پوشیدہ ہوں۔ مثال کے طور پر آتش کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے ؎

دور سے کوچۂ دلبر کو کھڑا تکتا ہوں　　نہ تو دیوار کا تکیہ ہے نہ در کا پہلو

مذکورہ شعر میں دیوار کا تکیہ اور در کا پہلو محض استعارہ برائے استعارہ مستعمل نہیں ہوا ہے۔ بلکہ ان کے اندر معانی کے کئی امکانات پوشیدہ ہیں۔ یہ شاعر کے اُس درد و کسک اور فریاد بے زبانی کی بھی تفسیر ہیں جن کا اُسے زیست کے سفر میں تجربہ ہو رہا ہے اور اُس محرومی کا بھی جس کے تصور سے اُس کا دل شکستہ ہے۔ یا مصحفی کا یہ شعر لیجئے ؎

دیا فشار مرے دل کو عشق نے یاں تک　　کہ اس میں خون تو کیا رنگِ آرزو نہ رہا

رنگِ آرزو استعارہ ہے جو اپنے اندر بڑی ندرت رکھتا ہے اور خون کے تضاد کو نمایاں کرتا ہے۔

اردو شاعری کا باقاعدہ آغاز ولی دکنی کے کلام سے ہوتا ہے۔ ولی سے لیکر کے آج تک اُردو شاعری میں تشبیہ اور استعارے کا برابر عمل دخل رہا ہے۔ تشبیہ، استعارہ اور علامت شعری اظہار و ابلاغ کے وہ وسایل ہیں جنہیں محض کلام کی تزئین یا آرائش و زیبائش کے

۱۔ اقبالیات، (اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سرینگر۔) اپریل ۱۹۸۶ء، ایڈیٹر پروفیسر آل احمد سرور، شمارہ ۳، ص ۱۴۵۔۱۴۶۔

خیال سے استعمال میں نہیں لایا جاتا بلکہ انہیں شعر میں پہلوداری، تہہ داری اور وسعت پیدا کرنے کی غرض سے بروئے کار لایا جاتا ہے۔ انہیں شعر میں توضیح معانی کی خاطر استعمال کیا جاتا ہے تاکہ کلام میں معنی آفرینی حسن آفرینی اور اختصار پیدا ہو۔ اس لئے استعارہ کو محض تزئینی چیز سمجھنا صحیح نہیں بلکہ استعارہ کو اگر شعر کے جوہر یا روح سے تعبیر کیا جائے تو غالباً غلط نہ ہوگا۔ کیونکہ اس کے بغیر کلام میں نہ تو زور پیدا ہو سکتا ہے اور نہ ہی تاثیر۔ اسی لئے غالبؔ کو کہنا پڑا۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

استعارہ ایجاز و اختصار کو بروئے کار لانے کا عمل ہے۔ یہ عمل تفصیلات اور تشریحات کو حذف کرنے کا عمل ہے۔ جامعیت استعارے کی بڑی خصوصیت ہے۔ استعارے کے استعمال سے کسی خیال کو محدود دائرے میں مقید نہیں کیا جاتا بلکہ اس سے خیال کی نئی راہیں ملتی ہیں اور ذہنی فضا میں وسعت اور تنوع پیدا ہوتا ہے۔

ارسطو نے استعارہ کو شاعر کی ''بہترین صلاحیت'' کا غماز قرار دیا ہے۔ ''بوطیقا'' کی رو سے استعارے پر قدرت رکھنا شعری کمالات میں سے بڑا کمال اور جینئیس (genius) ہونے کی علامت ہے۔ اس بیان یا کلیے کے تناظر میں اقبال کے کلام کا استعاراتی مطالعہ کیا جائے تو اقبال اپنے استعاراتی نظام کی وجہ سے یقیناً ایک بڑے نابغہ ہیں۔ استعاراتی اظہار کو عالمی ادب میں معیاری تصور کیا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شاعری کی زبان نثر کی زبان سے مختلف ہوتی ہے۔ نثر نگار سے کسی بھی خیال کو وضاحت اور صراحت کے ساتھ پیش کئے جانے کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ جب کہ شاعر الفاظ کے استعمال یا برتاؤ کے معاملے میں بڑا ہی کفایت شعار ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ کفایت لفظی سے کام لیکر تشبیہات، استعارات اور علامات کے ذریعے کم از کم الفاظ میں ایک گنجینۂ معانی آباد کر دیتا ہے۔ بقول غالبؔ

گنجینۂ معانی کا طلسم اس کو سمجھئے جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

علامہ اقبال نے بھی ''پیام مشرق'' میں رمز و ایماء میں بات کرنے کو فن تقریر کا کمال قرار

دیتے ہوئے کہا ہے۔

برہنہ حرف نگفتن کمال گویائی است　　حدیثِ خلوتیاں جُز بہ رمز و ایمانیست

اقبال کی شاعری کو استعارات کی شاعری قرار دیا گیا ہے۔ انہوں نے اپنے کلام میں کثرت سے استعارات کا استعمال کر کے ایک جہانِ معانی آباد کر دیا ہے۔ اشاروں میں بات کہنا دریا کو کوزے میں بند کرنا ہے۔ پھر شعری اسلوب کے لئے رمزیت ناگزیر ہے۔ اور یہی رمزیت زمان و مکان کی حدود کو توڑ کر شاعر کے کلام کو دوام اور آفاقی حیثیت عطا کرتی ہے۔ چنانچہ شاعر کی تفہیم کے لئے قاری کا ذہنی ریاضت کے جاں گداز عمل سے گزرنا ناگزیر ہے۔ ایک اعلیٰ پایہ فن پارے کی شناخت یہی ہے کہ اس میں معانی کے امکانات محدود نہ ہوں بلکہ ان پر ہر مرتبہ مختلف زاویہ نگاہ کی مدد سے نئے نئے معانی کا استخراج کیا جا سکے۔

اقبال کے کلام میں استعارات کی حیثیت تزئین کلام کی نہیں بلکہ بنیادی ہے۔ ہمارے کلاسیکی نظریئے کی رُو سے تشبیہ اور استعارہ کو کلام کا زیور متصور کیا جاتا تھا۔ اقبال کا بنیادی شعری اسلوب استعاراتی ہے۔ اُن کے یہاں استعارہ برائے استعارہ کا استعمال نہیں ملتا۔ حامدی صاحب نے بجا فرمایا ہے کہ اُن کے یہاں استعاراتی عمل شعوری کدو کاوش کا نتیجہ نہیں بلکہ ان کے تخلیقی ذہن کی پراسرار خاصیت کا مظہر ہے۔"[1]

اقبال نے کسی خیال یا مضمون کی ترسیل یا ابلاغ کے لئے استعارہ کو محض ایک وسیلہ، آلہ یا متبادل ذریعہ کے طور پر برتا ہے۔ ان کی شاعری میں استعارہ کو منزل نہ سمجھتے ہوئے اسے محض ایک راستہ سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ اصل منزل تو خیال ہے جسے شعر میں مرکزی اہمیت حاصل ہوتی ہے اور استعارہ ایک ضمنی چیز ہے۔ غالب کے بہت سے ناقدین نے تشبیہ اور استعارہ کے استعمال میں غالب کی عظمت کا راز تلاش کیا ہے۔ غالب کی شاعری میں اچھوتی تشبیہات اور جدید استعارات کے عمل سے ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ تاہم یہ

۱۔ اقبالیات، (اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سرینگر۔) اپریل ۱۹۸۶ء، ایڈیٹر پروفیسر آل احمد سرور، شمارہ ۳، ص ۱۴۶۔

بات یاد رہے کہ شعر میں بنیادی اہمیت خیال یا مضمون کو حاصل ہوتی ہے۔ اور اُس خیال کو موثر اور پہلو دار بنانے کی غرض سے کسی اچھوتی تشبیہ یا جدید استعارے کی مدد سے اسے کہاں سے کہاں پہنچایا جا سکتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ شعر میں مضمون اور استعارہ تانے بانے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا باہمی رشتہ لازم و ملزوم ہے۔ انہیں ایک اکائی یعنی Unity کے طور پر دیکھنا ناگزیر ہے۔

اقبال کے یہاں ابتدا میں تشبیہات کی فراوانی ملتی ہے۔ لیکن جیسے جیسے ان کے فکر و نظر میں پختگی اور گہرائی کے امکانات وسیع تر ہوتے گئے اسی اعتبار سے ان کے بلند تخیل اور فکر رسا سے نئے نئے استعارات خلق ہوتے رہے۔ بقول قاضی عبید الرحمان ہاشمی "جہاں تشبیہات ساتھ چھوڑنے لگتی ہیں وہاں صحیح معنوں میں استعارہ شاعر کی رفاقت کرتا ہے۔"
اقبال ایک غیر معمولی تخلیقی ذہن اور توانائی کے مالک تھے۔ وہ اُردو اور فارسی کی شعری روایت کا گہرا شعور بھی رکھتے تھے۔ ایک بڑا فن کار روایت کا پاسدار ہونے کے ساتھ ساتھ روایت میں جدت کا قائل بھی ہوتا ہے۔ اقبالؔ نے بھی روایت کی پاسداری کرتے ہوئے اس میں جدت پیدا کی ہے۔ انہوں نے بالعموم جن الفاظ و تلازمات کو بطور استعارہ برتا ہے۔ وہ ہماری گزشتہ شعری روایت کا ایک جزو رہے ہیں۔ اقبال نے انہیں الفاظ کو اپنی شاعرانہ بساط پر درآمد کر لیا۔ تاہم لفظیات و تراکیب کے اس قدیم سرمائے میں جو چیز استحکام پیدا کرتی ہے وہ ان الفاظ کے تئیں اقبال کا ذہنی رویہ ہے۔ یہ الفاظ تخلیق کی اُس جان گداز منزل سے ہو کر گزرے ہیں۔ جن کے بغیر ان کا وجود ممکن نہ تھا۔ ویسے دیکھا جائے تو الفاظ کے سرمائے میں اضافے کے امکانات کچھ زیادہ نہیں ہوا کرتے۔ ہر فن کار اپنی تخلیقی صلاحیت اور استعداد کے مطابق الفاظ و انسلاکات کے طریقہ کار سے معانی کی نئی جہتیں پیدا کرتا ہے۔ اقبال کو اپنی قادر الکلامی کے سبب فن پر اس قدر دسترس حاصل ہے کہ انہوں نے جن الفاظ کو بطور استعارہ برتا ہے۔ ان کا استعمال اُن سے قبل عام طور سے نہیں ملتا۔ اُن کے تخیل کی بلند رسائی اور ہمہ جہتی نے انہیں ایک خاص چیز بنا دیا ہے۔ مولانا شبلی "شعر العجم"

میں استعارے کے لئے جدت اور ندرت کی خصوصیات کو لازم قرار دیتے ہیں۔اقبال کے استعارات ان خصوصیات سے متصف ہیں۔ چنانچہ ناقہ شاہد قدرت، حدی خواں، نور کی بستی، تقدیر کا اختر، ظلمت شب، درماندہ کارواں، شررافشاں، نفسِ شعلہ بار، ٹوٹا ہوا تارہ، قیس، تنہائی، صحرا، شہر، بادیہ پیما، زائران چمن، شاخ نشیمن، چراغِ مصطفوی، شرار بولہبی، آہوئے تاتاری، چاند کے غار، نوائے صبح گاہی، طائر لاہوتی، بوئے اسدالٰہی، چوب کلیم، قافلۂ حجاز، دجلہ وفرات اور اس قبیل کے بیسیوں استعارات اقبال کے یہاں ایک نئی شعری لسانیات کی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔اور اس قبیل کے بیسیوں استعارات اقبال کے یہاں ایک نئی شعری لسانیات کی بنیاد فراہم کرتے ہیں اور اقبال کے لسانی شعور کی بیداری اور تابنا کی کے مظہر ہیں۔ مذکورہ استعارات میں سے چند اقبال سے قبل بھی شعراء حضرات نے برتے ہیں۔ مثلاً قیس، تنہائی، صحرا، شہر وغیرہ وغیرہ۔ تاہم ان میں سے اکثر و بیشتر استعارات فقط اقبال ہی سے مخصوص ہیں اقبال کی شاعری کا باقاعدہ طور پر ایک مقصد رہا ہے، چنانچہ چراغ مصطفوی، شرار بولہبی، آہوئے تاتاری، نوائے صبح گاہی، طائر لاہوتی، چوب کلیم، قافلہ حجاز، دجلہ وفرات جیسے استعارات کو اپنے سیاق وسباق میں دیکھا جائے تو بین طور پر ظاہر ہے کہ اقبال کا تخاطب کس سے ہے۔اور ان کا کیا مقصد ہے؟ اقبال پورے بنی نوع انسان بالخصوص اُمت مسلمہ کے دردمند اور بہی خواہ تھے۔اُن کے فکر وفن کا سرچشمہ اور ان کی شاعری کا اہم ترین ماخذ قرآن حکیم ہے۔ پیغمبر اسلامؐ کے بعد خلفائے راشدین صحابۂ کبار، اولیائے کرام اور رہبران ملت نے اپنے اپنے طور پر فرمان خداوندی اور حضور پُرنور کی تعلیمات کو پیش کیا۔اقبال بھی مسلمانوں کو وہی پیغام دینا چاہتے تھے مگر انہیں اپنی بات اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق کہنا پڑی۔ اقبال اپنی ملت کی نفسیات سے بخوبی آگاہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اپنے مافی الضمیر کو مسلمانوں تک پہنچانے کے لئے ایک ایسے طریقۂ کار کی ضرورت ہے جو موثر اور سودمند ثابت ہو (حالانکہ اقبال نے قوم کی غفلت شعاری جو انہوں نے اقبال کے کلام کے تئیں برتی، کی رہ رہ کر شکایت کی ہے)۔ چنانچہ

انہوں نے غور وفکر سے کام لیتے ہوئے اپنی بات کو علامات اور استعارات کی صورت میں قوم تک پہنچایا۔ اقبال کے استعارات اُن کے اسلامی ذہن، تاریخ اسلام کے گہرے مطالعے، موجودہ دور کے انسان بالخصوص مسلمان قوم کے مسائل سے گہری ہمدردی اور دردمندی کے جذبے اور اقبال کی گہری بصیرت کی غمازی کرتے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ کیجئے

؎ آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی — اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

؎ تازہ پھر دانشِ حاضر نے کیا سحرِ قدیم — گذر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوب کلیم

؎ نظر آئی نہ مجھے قافلہ سالاروں میں — وہ شبانی کہ ہے تمہید کلام اللہی

؎ قافلۂ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں — گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

اقبال نے اپنے استعاراتی شعور کی بلندی، پختگی اور بیداری کے سبب اردو شاعری کو وقار بخشا۔ اُن کے استعارات کی خصوصیت تحرک، فعالیت اور ان کا پر جوش ہونا ہے۔ انہوں نے بالعموم ساکن جامد اور خوابیدہ استعارات سے احتراز کیا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور اپنے مضمون ''اقبال کا فن۔ ایک عمومی جائزہ'' میں اقبال کی چند نظموں میں تشبیہات اور استعارات کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

''ہمالیہ اور جگنو جیسی نظموں میں تشبیہات اور استعارات ایک تو شاعر کے خیال کا رقص ظاہر کرتے ہیں۔ دوسرے شاعری کے جادو کو ایک رفعت، ایک فضائے بلند عطا کرتے ہیں۔ 'بزم انجم' میں شاعر کا منظر آرائی ہے مگر جنگ یرموک کا پہلا شعر حسن کاری کے جلال اور فضا بندی میں استعارے کا مرکزی کردار نمایاں کرتا ہے۔ ؎

صف بستہ تھے عرب کے جوانانِ تیغ زن — تھی منتظر حنا کی عروسِ زمینِ شام

۔۔۔ان کے جمیل اور جلیل استعاروں میں گماں آباد ہستی میں یقین مردِ مسلمان کا، بیابان کی شب تاریکی میں قندیل رہبانی اور عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں۔ کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہ کامل نہ بن جائے، یا ساقی نامہ میں جوئے کہستان کے علاوہ کتنے ہی جادوئی استعاروں کی مدد سے ایک فلسفہ کو پگھلا کر شعریت کا لاوا بنایا گیا ہے۔ یہی بات زمانہ اور

لالۂ صحرا میں ہے۔ اقبال کی تشبیہات و استعارات رفتہ رفتہ نشانات اور پھر علامات میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔"[1]

"بانگِ درا" اقبال کا پہلا اُردو شعری مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں اقبال کے فکر کے ابتدائی نمونے دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس مجموعے کا غائر مطالعہ کرنے سے انداز ہوتا ہے کہ اقبال مستقبل میں ایک انقلاب آفرین فنی بصیرت کا مظاہرہ کریں گے۔ "بانگ درا" میں بہت سی نظمیں ایسی ہیں جن میں برتے گئے استعارے اقبال کے رومانی میلان کو ظاہر کرتے ہیں۔ ہمالہ، پیام عشق، عشق اور موت، تصویرِ درد، نالۂ فراق، داغ، التجائے مسافر وغیرہ سے اس کی کئی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں دورِ اول میں بالعموم اقبال کا ذہن شرارہ، خار ماہی، خورشید، بجلی اور موج نفس کی طرف منعطف ہوتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ یہ استعارے اقبال کے جمالیاتی شعور اور آگہی کا بھی احاطہ کر لیتے ہیں تاہم ان سے اقبال کے اُس سوز دروں اور اُن کے ذہن کی اضطرابی کیفیت کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جو آگے چل کر اُن کے سازِ نفس کا دل نشین نغمہ بن کر ابھرتے ہیں۔ قاضی عبید الرحمان ہاشمی کے الفاظ میں "خار ماہی اور موج نفس زندگی کی اُس خراش اور پُر اسرار زیر و بم کا اشاریہ ہیں جو کشت زار وجود کو ہر آن ایک نئی سیرابی نئی پیاس اور نئے ولولوں سے ہمکنار کرتے ہیں۔"[2]

"بانگِ درا" کے حصہ دوم جو ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء پر محیط ہے، پر مشتمل کلام کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کا استعاراتی شعور مزید پختگی کی طرف رواں دواں ہے۔ اس کی مثالیں اس حصے میں شامل نظموں جیسے سوامی تیرتھ اور عاشق ہرجائی کے اشعار کے علاوہ دوسرے کئی غزلیہ اشعار سے پیش کی جا سکتی ہیں"[3]۔ مذکورہ حصے میں شامل تخلیقات میں اقبال نے سیماب، آتش زیرپا اور خارزار کو جس تناظر یا سیاق و سباق میں

۱۔ اقبالیات، شمارہ ۳، پروفیسر آل احمد سرور، اقبال کا فن۔ ایک عمومی جائزہ۔ ص ۲۲۔۲۳

۲۔ قاضی عبید الرحمان ہاشمی، شعریات اقبال۔

۳۔ ؎ کبھی جو آوارہ تھے وہ بستیوں میں پھر آبسیں گے — برہنہ پائی وہی رہے گی مگر نیا خارزار ہوگا

؎ چشم نابینا سے مخفی معنیٔ انجام ہے — تھم گئی جس دم تڑپ سیماب سیم خام ہے

؎ فیضِ ساقی شبنم آسا، ظرف دل دریا طلب — تشنۂ دائم ہوں آتش زیرپا رکھتا ہوں میں

پیش کیا ہے وہ اُس کی داخلی زندگی کی کیفیت یا تجربے کا صاف اظہار ہے جس سے اُس کی ذات ہر لمحہ دوچار رہتی ہے۔ ''بانگِ درا'' کے حصہ سوم میں شامل تخلیقات کے عنوانات اقبال کی شاعری میں فکری سنجیدگی کا احساس دلاتے ہیں۔ بلادِ اسلامیہ، ایک حاجی مدینے کے راستے میں، خطاب بہ نوجوانانِ اسلام، حضور رسالت مآب جواب شکوہ، فاطمہؓ بنت عبداللہ، جنگ یرموک کا ایک واقعہ، جیسی نظمیں پڑھ کر اقبال کے مطمحِ نظر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اقبال مسلمانوں کی زندگی میں ایک ذہنی انقلاب بپا کرنے کے خواہاں نظر آتے ہیں۔ چنانچہ قاضی عبیدالرحمان ہاشمی کے الفاظ میں ''اس دور میں ان کے تراشیدہ علائم واستعارات بھی زندگی کے ارتقائی وجدلیاتی ماہیت کی تشریح وتعبیر میں ان کی رفاقت کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔''[1]

تیسرے دور کی شاعری کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے کثرت سے استعارے کا استعمال کیا ہے۔ لیکن جن استعارات پر ہماری نگاہیں مرکوز ہوتی ہیں وہ اس طرح ہیں، جگر سوزی، آغوشِ موج، سوزِ ناتمام، جنون ویرانہ، آہوئے حرم، وسعت صحرا، چراغ حرم، سرشت سمندری اور سیل تندرو وغیرہ وغیرہ۔ اقبال نے ان استعارات کو جس شعری سیاق وسباق میں برتا ہے۔ وہ قاری کو حرکت اور عمل پر آمادہ کرتے ہیں۔

''بانگِ درا'' کے بعد جب ہم بال جبریل کا مطالعہ استعارات کی روشنی میں کرتے ہیں تو یہاں بھی اقبال کی شاعری ارتقاء کے عمل سے گزرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بال جبریل میں بعض مقامات پر ایسے استعارات کا بھی استعمال کیا گیا ہے جو ''بانگ درا'' میں پہلے ہی در آئے ہیں تاہم اس مجموعے میں بعض ایسے استعارے بھی استعمال کیے گئے ہیں۔ جو بال جبریل میں پہلی مرتبہ ہمارے سامنے آئے ہیں۔ اس قبیل کے استعاروں میں غوغائے رستاخیز، گوسفندی وبیشی، ضبطِ آہ، مغ زادے، نخچیرِ محبت، خلش پیکاں، آتش اللہ ہو، سوزِ تب ودرد وداغ، سوزِ سرور وسرود، حسینؓ، رنگِ حنا، خون دل وجگر، رگ ساز، صاحب ساز کا لہو، بھنور کی آنکھ، تماشائی، بادِ بیابانی، خاموشی ودل سوزی، سرمستی و

۱۔ قاضی عبیدالرحمان ہاشمی، شعریات اقبال، ص ۲۱۸۔

رعنائی، راکب، مرکب، عبرت کا تازیانہ، خضرِ بے دست و پا، الیاس بے دست و پا، مسافرِ شب، خلوت، راہبانہ، ہوائے بیابان، جھپٹنا، پلٹنا، لہو گرم رکھنا وغیرہ وغیرہ۔ ان الفاظ کا استعمال اردو کے شعری سرمائے میں اقبال سے قبل بھی کیا گیا ہے، تاہم یہ الفاظ اقبال کی تخلیقی فکر سے گزر کر جس ترکیب و امتزاج میں ڈھل کر سامنے آئے ہیں اس سے پہلے شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آئے ہیں۔ پروفیسر شکیل الرحمان نے صحیح فرمایا ہے کہ اقبال نے ''کلاسیکی اور روایتی استعاروں کو نئی صورتیں عطا کی ہیں۔ جن سے مفاہیم کا دائرہ پھیلا ہے اور علامتوں کی کچھ جہتیں ظاہر ہوئی ہیں۔''[1]

''ضربِ کلیم'' پہلی مرتبہ ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔ اس کا لب و لہجہ بڑا ہی تند و تیز اور تلخ ہے۔ یہ ایک طرح کا احتجاج ہے جو اقبال نے اپنے عہد کی بے بصری اور ذوقِ کم یابی کے خلاف کیا ہے۔ ضربِ کلیم کا لہجہ اپنے عہد کی فرعونیت کے خلاف کھلا اعلانِ جنگ ہے۔

جب تک نہ زندگی کے حقائق پر ہو نظر — تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ
یہ زورِ دست و ضربت کاری کا ہے مقام — میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ
خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات — فطرت لہو ترنگ ہے غافل نہ جل ترنگ

بالِ جبریل کی نسبت ''ضربِ کلیم'' میں اگرچہ ایسے استعارات کم ہی ملتے ہیں جن میں ندرت پائی جاتی ہو اور جو اپنے اندر معانی کی مختلف سطحیں رکھتے ہوں۔ تاہم سیل سبک سیر و زمین گیر، نہنگ، خرابی کنارہ، نیستان شعلۂ سوزاں، نفسِ گرم، جویائے تند و تیز، غواصِ معانی، بحرِ پر آشوب جیسے استعارات کی طرف ہماری توجہ خاص طور سے مبذول ہوتی ہے۔ مذکورہ مجموعے میں بالعموم شعلہ، سرکشی و بے باکی، طوفان، شرارہ، نگاہ، بجلی، دشت پیمائی، جرس، سوز، فولاد اور شمشیر جیسے استعارات ملتے ہیں۔

''ارمغانِ حجاز'' اقبال کا آخری شعری مجموعہ ہے۔ اس میں بقول قاضی عبیدالرحمان ہاشمی ''اُن شکستہ خوابوں اور سسکتی ہوئی آرزوؤں کے بھی جہان آباد ہیں جن کی تکمیل کا المیہ دلوں میں ایک ابدی کسک پیدا کر دیتا ہے۔''[2]

۱۔ اقبالیات، (اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سرینگر۔) اپریل ۱۹۸۶ء، ایڈیٹر پروفیسر آل احمد سرور، شمارہ ۳، پروفیسر شکیل الرحمان، اقبال، استعارہ، امیج، علامت۔ ص ۹۷۔

۲۔ قاضی عبیدالرحمان ہاشمی، شعریاتِ اقبال، ص ۱۷۷۔

یہاں ارمغانِ حجاز سے چند اشعار ملاحظہ کیجئے جو اقبال کی معاشرتی و تہذیبی فکر کے مظہر ہیں اور اقبال کے استعارات کی روشن مثالیں پیش کرتے ہیں

ہے ازل سے ان غریبوں کے مقدر میں سجود ان کی فطرت کا تقاضا ہے نمازِ بے قیام
ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا کند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغ بے نیام
اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا طبیعت کا فساد توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب
کارگاہ شیشہ جو ناداں سمجھتا ہے اسے توڑ کر دیکھے تو اس تہذیب کے جام و سبو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ کرتے ہیں اشکِ سحر گاہی سے جو ظالم وضو
کیا مسلمان کے لئے کافی نہیں اس دور میں یہ الٰہیات کے ترشتے ہوئے لات و منات

اقبال کی شاعری میں استعاراتی نظام پر بات کرتے ہوئے اقبال کے اساطیری استعارات کا ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ اساطیر کی کارفرمائی کو عظیم شاعری کا ایک ناگزیر حصہ قرار دیا گیا ہے۔ اقبال کا اساطیری شعور کافی بیدار تھا۔ اس لئے اُن کی شاعری میں اساطیری استعارات کی کارفرمائی بھی ناگزیر ہے۔ اُن کے یہاں دو طرح کی اساطیر ملتی ہیں۔ ایک وہ جو قیس و فرہاد اور لیلیٰ مجنون کی تصوراتی روایتوں اور دیگر تفصیلات سے اخذ کی گئی ہیں۔ دوسری طرح کی اساطیر کا تعلق حضرت موسیٰؑ اور حضرت ابراہیمؑ کی معجز نمائی اور تحیر زا واقعات سے ہے۔ اقبال کے یہاں ان دو پیغمبروں کے معجزات رہ رہ کر ابھرتے ہیں۔ قاضی عبید الرحمان ہاشمی کے الفاظ میں ان اساطیر کے حوالے سے شوکت و جلال اور روحانی ارتفاع کے علاوہ شاعر کے وہ عمرانی مقاصد بھی پورے ہوتے ہیں جو اس کی مصلحانہ ذات کا ایک ناگزیر حصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اساطیری کرداروں کی نمایندگی کے لئے ان پیغمبروں کا سہارا لیتا ہے جو پورے بنی نوع انسان کے لئے اپنا ایک شخصی کردار اور عمرانی منصب رکھتے ہیں۔"[1]

۱۔ قاضی عبید الرحمان ہاشمی، شعریاتِ اقبال، ص ۲۰۶۔

شیخ غلام قادر گرامی اور علامہ اقبال

فارسی کے باکمال شاعر، اقبال کے قریبی دوست اور بزرگ ہمعصر مولانا غلام قادر گرامی کا تعلق جالندھر سے تھا۔ اپنے کلام کو باقاعدہ طور پر ترتیب نہ دینے اور اُسے شائع نہ کرنے کے باعث اُن کا بہت سارا کلام تلف ہوگیا تاہم اُن کے انتقال کے بعد مولوی عزیز الدین عظامی اور حضرت میاں علی محمد صاحب سجادہ نشین لسی نو ہوشیار پور نے کوشش کرکے ''دیوانِ گرامی'' اور ''رُباعیات گرامی'' کے نام سے اُن کے کلام کے دو مجموعے شائع کیے۔ گرامی کے دیوان میں حمد، نعت، غزلیں، قصائد اور قطعات ہیں۔ اُنہوں نے مولانا روم کے تتبع میں ایک مثنوی لکھنا شروع کی تھی لیکن ''بھاری پتھر سمجھ کر چوم کر چھوڑ دی''۔ غنیمت کنجاہی کی مثنوی ''نیرنگ عشق'' کے جواب میں ''خراباتِ جنون'' لکھنے کی کوشش کی لیکن اسے پایہ تکمیل تک نہیں پہنچا سکے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کی شان میں ایک منقبت کہی تھی اور اس کی شرح فارسی نثر میں ''راہ فردا'' کے نام سے لکھی۔ یہ شرح گرامی کے اُردو مقدمے کے ساتھ امرتسر سے شائع ہوئی ہے۔ گرامی کلاسیکل فارسی میں ہی لکھتے تھے۔ تراکیب کے وضع کرنے میں انہیں ایک خاص مہارت حاصل تھی اس لئے اس ضمن میں اُن کے انداز کو مجتہدانہ حیثیت حاصل ہے۔ صنف غزل کے ساتھ انہیں گہرا شغف تھا۔ اُن کی چند غزلوں کے مطلعے ذیل میں بطور نمونہ درج ہیں ؎

عشق آمد و از عقل فسونگر نتوان گفت — پیداست کہ از پنہ واخگر نتواں گفت

پنہانم و پیدائم کیفم بشراب اندر — پیدائم و پنہانم بکباب اندر

دلم غریب و دو چشم تو قاتل افتاد است — یکی غریب و دو قاتل چہ مشکل افتاد است

گرامی کو رُباعی جیسے مشکل فن پر غیر معمولی دسترس حاصل تھی۔ یہ فن شاعر سے خاصی ریاضت کا متقاضی ہے، گرامی نے اس کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے۔ اُن کی رباعیات میں اُن کی غیر معمولی صلاحیتوں کے جوہر کھلتے ہیں۔

؎ خاور چکد از شبنم بایں تیرہ شبی کوثر چکد از لبم بایں تشنہ لبی
اے دوست ادب کہ در حریم دل ماست شاہنشہ انبیاء رسول عربیؐ

؎ اے ختم الرسل جانِ جہاں فار قلیطؐ خوانند ترا بر آسماں فار قلیطؐ
می گفت مسیح در بشارات جلیل من میروم آید بجہاں فار قلیطؐ

؎ اے ساقی مابادہ بدہ عصمت خیز کامد با داروگیر باطل بستیز
در ساغرم اے ساقی خمخانہ راز آن بادہ ز رمز اسمہ احمدؐ ریز

گرامی جیسا کہ مذکورہ بالا سطور میں عرض کیا گیا، علامہ اقبال کے بزرگ ہم عصر تھے، اقبال کو اُن سے بڑی عقیدت تھی، اقبال اُن کی غیر معمولی شعری صلاحیتوں کے دل سے قائل تھے اور ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ اُن جیسے اعلیٰ پایہ شاعر کا کلام تلف ہو، چنانچہ وہ اُنہیں اس متاعِ گراں کو شائع کرانے کی ترغیب دیتے تھے۔ جیسا کہ ایک خط میں موصوف کو لکھتے ہیں:

> ''اگر آپ اپنا کلام مجھے ارسال فرماتے رہیں تو میں تھوڑے عرصے میں آپ کا مجموعہ تیار کر کے دنیا کے سامنے اس بے بہا خزانے کو پیش کروں گا۔ افسوس ہے آپ نے اب تک اس طرف توجہ نہ کی۔ جو کچھ یاد آتا ہے لکھتے جایئے اور مجھے بھیجتے جایئے۔ اس زمانۂ انحطاط میں کسی مسلمان کا ایسا کلام ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ قوم میں زندگی کی قوتیں ابھی باقی ہیں۔''[1]

گرامی کی شہرت سے بے نیازی مسلّم ہے۔ اقبال دل سے اس بات کے خواہاں تھے کہ قارئین اُن کے جوہر سے روشناس ہوں۔ ایک مرتبہ اصرار کر کے اقبال نے اُنہیں انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں لاہور مدعو کیا۔ گرامی نے جلسہ میں ایک نظم سنائی۔

۱۔ محمد عبداللہ قریشی، مکاتیب اقبال بنام گرامی، ص ۱۳۔۱۴۔

نظم کی ابتداء میں اقبال نے اُنہیں حاضرین جلسہ سے متعارف کراتے ہوئے نہایت ہی فخریہ انداز میں فارسی کے ممتاز شعراء عرفی اور نظیری کے بعد کا درجہ دیا۔

"اگر عرفی و نظیری کے بعد فارسی زبان کا کوئی شاعر ہے تو گرامی ہے۔
گرامی کو سن لو۔ کل فخر کرو گے کہ تم نے گرامی کو سُنا اور دیکھا ہے۔"[1]

قدرت نے گرامی کو غیر معمولی حافظہ سے نوازا تھا۔ اشعار، نظمیں اور غزلیں تو درکنار، اُنہیں پوری پوری مثنویاں تک ازبر تھیں۔ بقول اقبال اُنہیں اپنا سارا کلام یاد تھا۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ گرامی اور اقبال دونوں ساتھ بیٹھے تھے۔ اسی اثناء میں اسد ملتانی اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ دونوں کے درمیان مختلف موضوعات پر بڑی دیر تک تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔ جب فارسی زبان کا ذکر چھڑ گیا تو اقبال نے گرامی کے متعلق اسد ملتانی سے کہا:

"ابھی ان کے (گرامی کے) حافظہ کا کرشمہ دیکھئے۔ یہ کہہ کر مولانا کو آواز دی۔ وہ اُٹھ بیٹھے۔ کہا کہ مولانا! حضرت نظامی نے وہ کیا فرمایا ہے؟

"زگرد بیاباں بیاباں گرد"

بس اس مصرعے کا سننا تھا کہ مولانا گرامی دونوں ہاتھوں کی شہادت کی انگلیاں اُٹھا کر جھومنے لگے اور کہنے لگے: اللہ اللہ اللہ اللہ

اس کے بعد ایک دوبار اس مصرعے کو دہرایا اور پھر وہیں سے مثنوی شروع کر دی۔ مزے لے لے کر شعر پر شعر پڑھتے گئے"۔[2]

اقبال گرامی کی غیر معمولی شعری صلاحیتوں کے معترف تھے۔ انہوں نے مولانا کے کلام کو وقتاً فوقتاً سراہا ہے۔ وہ اپنے اشعار گرامی کو بھیجتے تھے اور ان کی رائے طلب کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے اپنے چند اشعار گرامی کو بھیجے تو انہوں نے کچھ مشورے دئے اور تحریر کیا کہ شعر میں لفظ "مادر" استعمال کیا جائے۔ اقبال نے بعد میں دونوں مصرعوں میں مادر کا لفظ

۱۔ محمد عبداللہ قریشی، مکاتیب اقبال بنام گرامی، ص ۳۷۔
۲۔ جعفر بلوچ، اقبالیات اسد ملتانی، ص ۵۲۔۵۳

استعمال کیا۔ یوں تو گرامی نے ایک معمولی اشارہ کیا تھا لیکن اس معمولی اشارے نے اقبال کے ذہن کو کسی اور گوشے کی طرف منعطف کیا اور اس طرح انہیں خاصا فائدہ ہوا۔ ۱۶ جولائی ۱۷ء کے مکتوب میں گرامی کو لکھتے ہیں:

"حضرت فاطمہؓ کے متعلق جو اشعار میں نے لکھے تھے۔ اس کے آخر تک اشعار اس طرح ہیں۔

مادر آں مرکز پرکار عشق	مادر آں کارواں سالار عشق
آن یکے شمع شبستانِ حرم	حافظ جمعیت خیر الامم
تا بمیرد آتش پیکار و کیں	پشت پازد بر سرتاج و نگیں
واں دگر مولائے ابرارِ جہاں	قوت بازوئے احرار جہاں
در نوائے زندگی سوز از حسینؑ	اہل حق حریت آموز از حسینؑ

"آپ نے لکھا تھا کہ دونوں مصرعوں میں "مادر" کا لفظ ہونا چاہیے۔ معلوم نہیں آپ کے ذہن میں کیا نکتہ تھا، جس کے بیان کرنے کا وعدہ آپ نے کیا تھا۔ میں نے اس اشارہ سے یہ فائدہ اٹھایا ہے کہ بعد کے اشعار میں حضرت حسنؓ و حسینؓ دونوں کا ذکر کر دیا ہے۔ اب ان اشعار کے بعد کا مضمون یہ ہے کہ ایسے بیٹوں سے، جن کے یہ اوصاف ہیں، ماں کی تربیت کا اندازہ کرنا چاہیے تا کہ معلوم ہو کہ اس ماں کی آغوش میں کیا تاثیر تھی جس میں ایسے بچوں کی پرورش ہوئی۔ اس مضمون کو ایک شعر میں ادا کرنا چاہتا ہوں، غور فرما کر کوئی اشارہ دیجئے۔"[1]

اقبال کو جب کوئی شعر پسند آتا تھا یا ان کی نظر سے کوئی تخلیق گزرتی تھی تو اسے گرامی کی خدمت میں بھیجتے اور اس کی باریکیوں پر گرامی کو بھی شریک گفتگو کرتے تھے۔ اس کے علاوہ گرامی جب کسی شعر میں تصرف کرتے تھے تو اقبال اس کی تعریف کرتے تھے۔ ۳۱

۱۔ محمد عبداللہ قریشی، مکاتیب اقبال بنام گرامی، ص ۱۳۱۔

مارچ ۱۹۲۱ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"گرامی کے تصرف کا صلہ دست بوسی ہی تھا۔ البتہ عرفی کے عتاب کو میں حق بجانب سمجھتا ہوں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ عرفی کا پہلا مصرعہ اس قابل ہے کہ اس میں تصرف کیا جائے اور لفظ "دراز" شعر کو زندہ کرنے کے لئے ضروری ہے مگر بحیثیت مجموعی آپ کا مصرعہ براہ تست مرا رشتۂ امید دراز" کھٹکتا ہے۔ بھلا اگر یوں لکھئے تو کیسا ہو۔

زفیضِ مژدۂ لطفِ تو روز عیش دراز بہ عہدِ وعدۂ وصلِ تو عمرِ غم کوتاہ[1]

اقبال گرامی کے اشعار پر مناسب داد دیتے تھے۔ جیسا کہ اس خط سے ظاہر ہے:

"آپ کی رباعی کی داد دینا بھول گیا تھا۔

باخود در بے خودی رسیدن سہل است بے خود در خود رسی حضوری این است

سبحان اللہ! ایک نہایت طویل و عریض مضمون کو آپ نے ایک مصرع میں نظم کر دیا ہے۔ سلطان ابوالخیر کی روح بھی تڑپ اُٹھی ہوگی"۔[2]

گرامی کے اس شعر ؎

کتاب عقل ورق در ورق فرو خواندیم تمام حیلہ فروشی و مدعا طلبی است

پر اقبال لکھتے ہیں:

"مضمون میرے حسب حال تھا۔ تمام عمر کتابوں کی ورق گردانی میں گزری اور آخر یہ معلوم ہوا کہ کتاب حیلہ فروشی اور مدعا طلبی کے سوا کچھ نہیں۔ عقل اس سے بڑھتی ہے مگر دل روشن نہیں ہوتا۔ آپ کا شعر پڑھتے ہی میری آنکھوں سے اس زور کے ساتھ آنسو اُمڈے کہ ضبط نہ ہو سکا"۔[3]

اقبال اس بات کے خواہاں تھے کہ گرامی ان کے اشعار پر اپنی رائے کا اظہار کریں۔

۱۔ محمد عبداللہ قریشی، روح مکاتیب اقبال، ص ۲۶۱۔
۲۔ محمد عبداللہ قریشی، روح مکاتیب اقبال، ص ۲۷۳۔۲۷۴۔
۳۔ محمد عبداللہ قریشی، روحِ مکاتیب اقبال، ص ۲۷۵۔

ایک مرتبہ گرامی نے اُن کی غزل کے ایک شعر پر اعتراض کیا تھا تو بعد میں اقبال نے انہیں لکھا کہ براہِ کرم غزل کے تمام اشعار پر اعتراض کیجئے کیونکہ اعتراض وتنقید سے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"آپ کے کسی شعر میں اگر کوئی بات مجھے کھٹکے تو میں بلا تکلف عرض کر دیا کرتا ہوں۔ آپ کیوں ایسا نہیں کرتے۔ مجھے تعریف سے اس قدر خوشی نہیں ہوتی جتنی اعتراض سے۔ کیونکہ اعتراض کی تنقید سے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔"[1]

اقبال گرامی کی تنقیدوں سے اکتساب فیض کرتے تھے۔ گرامی نے بھی اقبال کی تنقیدوں سے فیضان حاصل کیا ہے۔ ایک مرتبہ انہوں نے اپنی ایک غزل رسالہ "ہمایوں" میں شائع کرانے کے لئے اقبال کو بھیجدی۔ اقبال نے میاں بشیر احمد کو پہنچانے کی بجائے بعض باتوں کی طرف توجہ دلا کر گرامی کو واپس بھیجدی تا کہ وہ اس پر نظر ثانی کریں۔ اس غزل کے متعلق وہ لکھتے ہیں:

"میں نے نہ چاہا کہ شائع ہونے کے بعد کوئی اس پر اعتراض کرے۔ اس واسطے بعض باتوں کی طرف آپ کی توجہ دلائی۔ اگر آپ کو مجھ سے اتفاق نہ ہو تو اسی طرح رہنے دیجئے کیونکہ آپ کا مذاق زیادہ معتبر ہے۔"[2]

گرامی نے جواب میں لکھا کہ غزل واپس بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔ خود ہی اصلاح کر دی ہوتی۔

گرامی فارسی شعر وادب کی ایک جامع شخصیت تھے اور اقبال کے گہرے دوست بھی تھے۔ جب اقبال نے اپنے بلند افکار کے اظہار وابلاغ کے لئے فارسی زبان کو ذریعۂ اظہار بنایا تو انہیں بعض نازک اور باریک نکتوں کی خاطر فارسی کے کسی اہلِ نظر اور رمز شناس سے

۱۔ محمد عبداللہ قریشی (مرتب)، مکاتیب اقبال بنام گرامی۔ ص ۶۸۔۶۹۔
۲۔ محمد عبداللہ قریشی (مرتب)، مکاتیب اقبال بنامِ گرامی۔ ص ۷۲۔

مذاکرات کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ان کی نظر میں گرامی ایک مناسب اور موزون شخصیت تھے۔ چنانچہ انہوں نے ان کی طرف رجوع کیا۔ محمد عبداللہ قریشی لکھتے ہیں:

> ''اقبال رموزِ بے خودی کی تصنیف میں مصروف تھے اور انہیں قدم قدم پر گرامی کے مشورے کی ضرورت پیش آتی تھی چنانچہ رموزِ بے خودی کے سب سے پہلے ایڈیشن کے دیباچے میں، جو بعد کے ایڈیشنوں سے حذف کر دیا گیا، گرامی کا شکریہ ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے۔ اُستاذی علامہ میر حسن صاحب اور مولانا شیخ غلام قادر گرامی شاعرِ خاص حضور نظام دکن خلد اللہ ملکہ، واجلالہ میرے شکریے کے خاص طور پر مستحق ہیں کہ ان دونوں نے بعض اشعار کی زبان اور طرزِ بیان کے متعلق قابل قدر مشورہ ملا۔''[1]

اقبال اکثر اوقات اپنے خادم علی بخش کو (جو ہوشیار پور کا رہنے والا تھا) گرامی کے پاس بھیجتے تھے تا کہ انہیں لاہور بلا لیں۔ گرامی جب اقبال کے مہمان ہوتے تو وہ ان کی ناز برداریاں کرتے۔ ہر طرح سے ان کے آرام و آسائش کا خیال رکھتے۔ ان سے گفتگو کرتے اور شاعری کے نکات پر بحث مباحثہ ہوتا۔ اقبال انہیں اپنا کلام سناتے اور وہ گرامی سے ان کے اشعار سنتے اور مستفید ہوتے۔ ان کی تنقیدوں اور موشگافیوں سے اکتساب فیض کرتے۔ جب گرامی اقبال کے یہاں پہنچ جاتے تو پھر لوٹنے کا نام نہ لیتے۔ ان کی بیگم بیماری کا بہانہ کر کے انہیں بلا لیتیں مگر گرامی پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ پھر کئی روز کے بعد جب جانے کی تیاری کرتے تو اقبال کہتے کہ آپ جس وقت جانا چاہیں گے، میں اُسی وقت بھجوا دوں گا۔ لیکن ایک رُباعی ذہن میں اڑ گئی ہے۔ تین مصرعے ہو چکے ہیں۔ اب چوتھا باقی ہے۔ ذرا اس پر غور فرمایئے۔ شاید مصرعہ ہو جائے۔ یہ بات سنتے ہی گرامی چوتھے مصرعے کی فکر میں اسطرح مستغرق ہو جاتے کہ بیگم کا خیال ہی نہیں رہتا۔ اقبال یونہی مصرعہ نہ سوجھنے کا بہانہ کرتے۔ ان کا مدعا یہ ہوتا تھا کہ گرامی کسی طرح کچھ دن اور قیام کریں۔ یہ

۱۔ دیباچۂ رموزِ بے خودی، پہلا ایڈیشن، بحوالہ مکاتیب اقبال بنامِ گرامی (مرتب محمد عبداللہ قریشی)، ص ۶۸۔۶۹۔

معاملہ یک طرفہ نہ تھا بلکہ گرامی بھی اقبال کی صحبتوں سے محظوظ ہوتے۔ بعض لوگوں نے دونوں کے اخلاص، عقیدت اور محبت کو اُستادی اور شاگردی کے رشتے پر مبنی قرار دیا ہے۔[1] حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ حق تو یہ ہے کہ یہ دونوں بڑی شخصیتیں تھیں اور دونوں ایک دوسرے سے متاثر ہوئیں۔ اقبال نے گرامی کو "پیر مغاں" کہا ہے۔ وہ انہیں ولی سمجھتے تھے۔ اقبال کو گرامی کی نیت اور نیک نفسی پر یقین واثق تھا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اگر کسی شخص کے نزدیک گرامی کی نیت اور نیک نفسی مشکوک ہے وہ کافر ہے۔ اقبال کے نزدیک گو گرامی کا جسم فانی ہے لیکن انہیں اپنے کارناموں کی بدولت حیات جاوداں حاصل ہے۔ اقبال نے اُنہیں "پیر کہن" کہا ہے۔

"گرامی معجز نگار ہندوستان کے لئے سرمایۂ ناز ہے۔ آج ایران میں بھی ایسا سحر طراز نہ ہوگا۔ زندہ باش۔ اے پیر کہن"[2]

دیوان گرامی اور رباعیات گرامی میں مختلف مقامات پر گرامی نے اقبال کو خراج عقیدت اس طرح پیش کیا ہے۔

درس ماضی از کتاب حال گیر — ساغر از خمخانۂ اقبال گیر
حضرت اقبال آن بالغ نظر — دارد از بود و بنود ما خبر
ما بہ ذوق سوختن کم ساختیم — بے خودی را از خودی نشناختیم
آں نوا پرداز اسرار ازل — شہسوار عرصۂ علم و عمل
بیخودی را در خودی منزل شناس — درغبار کارواں محمل شناس
از نوائش بزم یورپ در خروش — حکمت امریکہ اُولا سفتہ گوش
نالہ ہائے آتشینِ آں حکیم — سوخت رخت فتنۂ امید و بیم

۱۔ ۱۹۲۵ء میں رسالہ شمع آگرہ کے ایڈیٹر حسن عابد جعفری صاحب نے مولانا گرامی کی ایک فارسی غزل پر تعارفی نوٹ تحریر کیا تھا کہ اقبال کو گرامی سے نسبت تلمذ حاصل ہے۔ اس پر اقبال نے اُسی وقت ایڈیٹر کو لکھا کہ وہ گرامی کے شاگرد نہیں اور اس طرح یہ غلط فہمی رفع کردی۔

۲۔ مکتوب اقبال بنام گرامی۔ بحوالہ مکاتیب اقبال بنام گرامی (مرتبہ محمد عبداللہ قریشی)، ص ۲۷۔

ساخت با دلہا و بودش ہیچ نیست　　سوخت دل ہارا و دودش ہیچ نیست

یہ نظم باقیات اقبال میں ''نذرانۂ عقیدت بزبان گرامی'' کے عنوان سے درج ہے۔ ظہوری کی ایک غزل جس کا مطلع ہے۔

ستم و سخت جانی ہم ہست　　کو ہم و ناتوانی ہم ہست

گرامی نے اس پر ایک غزل کہی جو فروری ۱۹۲۴ء کے ''معارف'' میں شائع ہوئی۔ اس میں ایک مصرعہ اس طرح تھا۔　فقر راتر کمانیٔ ہم ہست

اقبال کو یہ مصرعہ بہت پسند آیا تھا اور انہوں نے اس پر تضمین کر کے اسے اور روشن کر دیا۔ انہوں نے ایک مکتوب میں سید سلیمان ندوی کو لکھا تھا کہ ''پیام مشرق'' میں اسے اس لئے شامل نہ کیا کہ اس کے اشعار کی بندش کچھ بہت پسند نہ آئی۔ اگر آپ کو پسند ہو تو مجھے اشاعت میں کوئی عذر نہیں، اس پر مولانا نے انہیں لکھا:

''یہ سچ ہے کہ 'پیام مشرق' کے ساز میں یہ لحنِ شیرازی کچھ زیادہ سامع نواز نہ ہو تو بھی اس سے الگ اقبال کا ہر حرف گوشوارۂ حقیقت ہے''۔[1]

تضمین اس طرح ہے ؎

سخنے راندۂ کہ جز قرشی　　برسر مسند نبیؐ نہ نشست

درس گیر از گرامیؔ ہمہ درد　　کہ برید از خود و باد پیوست

رمز ترک و خلافت عربی　　گفت آن مے گسار بزم الست

ماہ را بر فلک دو نیم کند[2]　　فقر را ترکمانیٔ ہم ہست

گرامی نے اقبال کے صاحبزادے جاوید اقبال کی ولادت پر بھی چند رباعیات کہی ہیں جو ''رباعیات گرامی'' میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ملاحظہ کیجئے ؎

جاوید امید ڈاکٹر سر اقبال　　ناوردہ بد ہر مادر دہر مثال

۱۔ معارف، فروری ۱۹۲۴ء ص ۱۴۴۔

۲۔ باقیات اقبال میں کنیم لکھا ہے۔

دررشتۂ عمرش چہ مبارک گرہی ہست تمہید کشادر آرزو ہر سال
جاوید اقبال سرو باغ اقبال بالیدہ در آغوشِ ادب مثل ہلال
سر خطِ رموز معنیٔ دانش و عقل سر جلوۂ ذوق نکتۂ ماضی و حال

ان رُباعیات سے اقبال اور گرامی کے باہمی مراسم کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے علاوہ گرامی نے ایک دفعہ انجمن حمایت اسلام لاہور کے ایک جلسے میں چند رباعیات پڑھی تھیں جن سے اقبال کی عظمت، خداداد صلاحیت، ہمہ گیر شہرت اور جذبۂ اخوت کے متعلق ان کے جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ چند رباعیات پیش ہیں۔

حکمت آموز حال و استقبال وہ چہ علامہ ایست سر اقبال
می دہد جلوہ حال را در قال گوئٹے را جواب سر اقبال
الہام بودہمہ کلام اقبال شہباز معانی ست بدام اقبال
سر بر خط او نہد گرامی کہ قضا زد سکۂ خسروی بنام اقبال
اقبال کہ نظم او ادب پیغام است سر جلوۂ آغاز وفا انجام است
برخیز کہ جلوہ ریزاں جو ہر فرد در انجمنِ حمایت اسلام است

اقبال نے اپنے ۱۲، اکتوبر ۱۹۱۸ء کے خط میں گرامی کو اس طرح خطاب کیا۔

"گرامی مسلم ہے اور مسلم تو وہ خاک نہیں کہ خاک اسے جذب کر سکے۔ یہ ایک قوت نورانیہ ہے کہ جامع ہے جواہر موسویت و ابراہیمیت کی۔ آگ اسے چھو جائے تو بردوسلام بن جائے۔ پانی اس کی ہیبت سے خشک ہو جائے۔ آسمان و زمین میں یہ سما نہیں سکتی کہ یہ دونوں ہستیاں اس میں سمائی ہوئی ہیں۔ پانی آگ کو جذب کر لیتا ہے۔ عدم بود کو کھا جاتا ہے، پستی بلندی میں سما جاتی ہے۔ مگر جو قوت جامع اضداد ہو اور محلل تمام تناقضات کی ہو اُسے کون جذب کرے؟ مسلم کو موت نہیں چھو سکتی کہ اس کی قوت حیات و موت کو اپنے اندر جذب کر کے حیات و ممات کا تناقص

مٹا چکی ہے۔"[1]

گرامی کو اقبال سے بڑی محبت تھی۔ چنانچہ مرض الموت کے ایام میں رہ رہ کر انہیں یاد کیا کرتے تھے۔ جب ان کا (گرامی) انتقال ہوا تو اقبال نے گرامی کی وفات پر ایک درد انگیز نظم کہی جس میں اپنے دلی جذبات اور دردوالم کا اظہار کیا۔ اس نظم کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک عظیم شاعر دوسرے بزرگ شاعر کو خراج پیش کر رہا ہے۔ گرامی کے سانحۂ ارتحال پر اقبال کے یہ اشعار ملاحظہ کیجئے۔

آہ مولانا گرامی از جہاں بربست رخت — آنکہ زد فکر بلندش آسماں را پشتِ پای
معنیٔ مستور او در لفظ رنگینش نگر — مثل حورے بے حجاب اندر بہشت دلکشائی
از نوائے جاں فزائے او عجم را زندگی — جام جمشید از شراب ناب او گیتی نمای
یاد ایامے کہ با او گفتگو ہا داشتیم — اے خوشا حرفے کہ گوید آشنا با آشنای
بر مزارش پست ترکن پردہ ہائے ساز را — تا نہ گردد خواب او آشفتہ از شورِ نوای

۱۔ مکاتیب اقبال بنام گرامی، (مرتبہ محمد عبداللہ قریشی)، ص ۱۴۷۔

اسدؔ ملتانی۔ اقبالؔ کے ایک ہم عصر

اسدؔ ملتانی کی ولادت ۱۳ دسمبر ۱۹۰۲ء کو کٹڑی ملتان شہر میں ہوئی۔ ان کا اصلی نام محمد اسد خان تھا۔ ان کے والد ماجد غلام قادر خان ایک شیرانی افغان تھے۔ اسد ملتانی نے چرچ مشن ہائی اسکول ملتان میں میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۲۱ء میں گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا، جہاں سے ۱۹۲۴ء میں بی۔ اے۔ کا امتحان پاس کیا۔ اُنہیں سائنس اور فلسفے کے مضامین سے گہرا شغف تھا چنانچہ ایک ہفت روزہ ''الشمس'' کے نام سے جاری کیا اور سائنس پر مبنی ایک ماہنامہ ''روشنی'' کا اجراء کیا۔ اسدؔ ملتانی کو بچپن سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ اور ان کا کلام جلد ہی مشہور و معروف رسائل اور اخبارات میں شائع ہونے لگا۔ ان کی تخلیقات ایران و افغانستان تک پہنچیں۔ ''اقبالیات اسدؔ ملتانی'' کے مصنف جعفر بلوچ اس ضمن میں لکھتے ہیں۔

''جناب اسد کا اردو اور فارسی کلام ملک کے مقتدر اخبارات اور جرائد مثلاً زمیندار، انقلاب، معارف (اعظم گڈھ) طلوع اسلام، نیرنگ خیال، ہمایوں، فاران (کراچی) نمکدان اور عالمگیر (لاہور) میں شائع ہوتا تھا۔ بعض فارسی نظمیں ایران اور افغانستان کے رسائل میں بھی شائع ہوئیں۔''[1]

اسدؔ ملتانی سے ملتان میں باقاعدہ صحافت نگاری کا آغاز ہوا۔ پروفیسر جعفر بلوچ شبیر حسن اختر کے الفاظ میں ان کی صحافتی خدمات کا اعتراف مندرجہ ذیل الفاظ میں یوں کرتے ہیں:

''ملتان کی صحافت کا باقاعدہ آغاز یہاں کے مایہ ناز شاعر جناب اسد ملتانی کے ہاتھوں ہوا۔ انہوں نے ۲۸ نومبر ۱۹۳۲ء کو 'الشمس' کے نام سے ہفتہ وار

۱۔ پروفیسر جعفر بلوچ، اقبالیات اسد ملتانی، ص ۱۶۔

اخبار اور 'انعام' کے نام سے ماہنامہ نکالا۔۔۔ ہفتہ وار 'الشمس' ملتان کا باقاعدہ اخبار تھا جو اس قدر مقبول ہوا کہ ہندوستان کے طول و عرض کو عبور کر کے جاوا، عراق، اور مشرقی افریقہ تک پہنچتا تھا۔ ہفتہ وار 'الشمس' ہندو مسلم کشاکش کی وجہ سے ۱۹۲۳ء کے وسط میں بند کر دیا گیا لیکن اس نے تھوڑے سے عرصے میں یہاں کی صحافت میں ایک ایسی روح پھونکی کہ اس کے بعد بہترے اخبارات منظر عام پر آنے لگے اور بالآخر یہ سلسلہ روزنامہ اخبار کے اجراء پر منتج ہوا۔[1]

اسد ملتانی نے کچھ عرصہ تک ملتان کے ہائی اسکول میں بحیثیت ٹیچر کام کیا۔ ۱۹۳۶ء میں گورنمنٹ آف انڈیا کی سیکریٹریٹ میں سینئر کلرک ہو کر دہلی چلے گئے۔ پہلے فارن اینڈ پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ میں اسسٹنٹ اور پھر بحیثیت سپرانٹنڈنٹ کام کیا۔ تقسیم ملک کے بعد پاکستان چلے گئے اور کراچی میں گیارہ برس رہے۔ مرکزی صدر مقام کی تبدیلی کے ساتھ راولپنڈی آئے اور نومبر ۱۹۵۹ء میں وزارتِ خارجہ میں ریاست ہائے سرحدات کے ڈپٹی سیکریٹری مقرر ہوئے۔ کچھ دن بعد وہیں اُن کا انتقال ہوا۔

کالج کی طالب علمی کے ایام میں اُن کا ذوق شعری پروان چڑھا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پختہ ہوتا گیا۔ انہوں نے اردو، فارسی اور سرائیکی میں اپنی یادگاریں چھوڑی ہیں۔ اُن کا زیادہ تر کلام اردو میں ہے۔ ۱۹۳۸ء میں ''مرثیۂ اقبال'' کے نام سے ایک مختصر رسالہ شائع کیا۔ ۱۹۵۴ء میں بیت اللہ شریف کے سفر کے دوران چند نظمیں کہی تھیں جو ''تحفۂ حرم'' کے نام سے ایک مختصر گلدستے کی شکل میں شائع ہوئیں۔ اسد ملتانی کی شعری خدمات کے سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ وہ حکومت ہند میں ملازمت کے دوران بزم اردو شملہ کے سیکریٹری بھی تھے۔ بزم کے مشاعروں کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ جعفر بلوچ منشی عبدالرحمن کے حوالے سے لکھتے ہیں:

۱۔ پروفیسر جعفر بلوچ، اقبالیات اسد ملتانی، ص ۱۹۔۲۰۔

"آپ شملہ میں ہر سال ایک عظیم الشان مشاعرہ کیا کرتے تھے۔ وہ مشاعرے اتنے اہم اور اعلیٰ سوسائٹی میں اتنے مقبول ہوتے تھے کہ ان کے ٹکٹ اکثر وزراء کی سفارش پر ملا کرتے تھے۔ ایک مشاعرہ کی صدارت مسٹر غلام محمد نے کی جو آخر میں پاکستان کے گورنر جنرل کے عہدے تک پہنچے تھے۔ ان مشاعروں میں شریک ہونے والے زیادہ تر اونچے طبقے کے لوگ ہوتے تھے، یہاں تک کہ ایک مشاعرہ میں ۱۹ سر موجود تھے۔"[1]

اسد ملتانی نے غزل اور نظم دونوں اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں اور بحیثیت نظم نگار اُن کی حیثیت مسلّم ہے۔ اُن کی نظموں میں اکبر کا طنز، حالی کی نصیحت آموزی، اقبال کا تفکر، اور حب الوطنی کا نہایت عمدہ امتزاج ملتا ہے۔ وہ دورِ جدید کے اُن شعراء میں سے ہیں جنہوں نے حالی اور اقبال کی روش شاعری کو آگے بڑھایا۔ ان کے کلام میں اسلام اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے مضامین مذہبی و سیاسی مسائل کا بیان، قومی و ملی عظمت کے ترانے، حسن عمل کی تلقین اور اخلاقی اقدار کا پرچار ہے۔

گورنمنٹ کالج میں عرصے سے یہ روایت چلی آئی تھی کہ سالانہ جلسہ تقسیم انعامات میں ایک انعام کالج کے بہترین شاعر کو بھی دیا جاتا تھا۔ اسد ملتانی نے کالج میں سال اول کی طالب علمی کے ایام میں ایک دوست کے اصرار پر نظم "شبنم کا قطرہ" انعامی مقابلے کے لئے پیش کی۔ اس انعامی مقابلے کا فیصلہ اقبال نے کیا تھا۔ اور اسد ملتانی کی نظم کو اول قرار دیا تھا۔ کالج کا دستور یہ تھا کہ انعام حاصل کرنے والے طالب علم کو اپنی نظم سالانہ جلسے میں سنانی ہوتی تھی۔ اقبال نے نظم پر جا بجا اصلاح دی تھی اور سست بندشوں کو چست کر دیا تھا۔ اس ضمن میں اسد ملتانی کا خود نوشت بیان ملاحظہ کیجئے:

"جس روز جلسہ ہوا، میری نظم میرے حوالے کر دی گئی۔ یہ دیکھ کر میری مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ نظم پر جا بجا اصلاح بھی موجود تھی۔ اُس وقت

۱۔ چند نا قابلِ فراموش شخصیات، ص ۲۷۴، بحوالہ اقبالیات اسد ملتانی (از جعفر بلوچ)، ص ۱۹۔

تو میں اس اصلاح کو نہ پوری طرح پڑھ سکا اور نہ اچھی طرح سمجھ سکا۔ اور جہاں تک مجھے یاد ہے اس جلسے میں، میں نے کہیں اصل اور کہیں اصلاح کے مطابق نظم پڑھ دی تھی۔ لیکن بعد میں جب غور سے دیکھا تو اصلاح کی اہمیت محسوس ہوئی۔ چند روز کے بعد میں خود علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان دنوں وہ انارکلی والے بالا خانے میں قیام فرما تھے۔ میں جھجکتے جھجکتے اوپر پہنچا۔ انہوں نے پاس کی ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گیا۔ وہ خود ایک آرام کرسی پر لیٹے ہوئے حقہ پینے میں مصروف تھے۔۔۔ کچھ دیر بعد میری طرف مستفسرانہ انداز میں توجہ فرمائی تو میں نے اپنا تعارف اس طرح کرایا کہ وہ اصلاح شدہ نظم ان کی خدمت میں پیش کر کے اُن کی توجہ خاص کر شکریہ ادا کیا۔ دیکھ کر فرمایا کہ ہاں یہ نظم مجھے پسند آئی تھی۔ اس خیال سے کہ یہ کہیں شائع ہوگی۔ میں نے جہاں جہاں ضروری سمجھا، اصلاح کر دی۔ اس کے بعد کچھ وقت اصلاح کے متعلق باتیں ہوئیں۔ چونکہ بہت دیر ہوگئی تھی۔ آخر میں نے اجازت طلب کی اور اس محفل خاص سے رخصت ہوا۔۔۔ یہ تھی علامہ کی خدمت میں میری پہلی حاضری، اور یہ تھی وہ صورت حالات جس کے تحت میری نظم کو حضرت علامہ کے قلم سے اصلاح کا شرف حاصل ہوا۔"[1]

اس کے بعد اسد ملتانی اکثر اوقات اقبال کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن سے فیضان حاصل کرتے رہے۔ اُن کا ایک مضمون "فیضانِ اقبال" کے عنوان سے اسی قسم کی ایک ملاقات کی تفصیل پر مبنی ہے۔

مارچ ۱۹۳۳ء میں اقبال غازی رؤف پاشا کی تقریر کے موقعے پر جلسے کی صدارت کے لئے جامعہ ملیہ دہلی گئے۔ وہ ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی "دارالسلام" میں مقیم تھے۔ ان دنوں

۱۔ محمد عبداللہ قریشی، معاصرین اقبال کی نظر میں، ص ۴۸۲، ۴۸۴۔

اسد ملتانی دہلی میں رہتے تھے۔ وہ اپنے احباب امداد حسین اخگر مراد آبادی اور مولوی احمد خان ندوی کے ساتھ اقبال سے ملاقات کے لئے اُن کی قیام گاہ پر گئے۔ اس ملاقات میں وضع الفاظ وتراکیب، اُردو میں پنجابی کے استعمال، مغرب کی تقلید، مکتوبات مجدد سرہندی، اسلام کے مستقبل، فلسفہ اور مذہب، غیر معمولی انسان، عالم اسلام، مرد منتظر، مقصد حیات، فہم قرآن اور دوسرے موضوعات پر گفتگو ہوئی۔ یہ محفل تین گھنٹے تک جاری رہی۔ اسد ملتانی نے اقبال کے فرمودات اپنی ڈائری کے اوراق پر محفوظ کر لئے۔ مذکورہ علمی نشست میں اسد صاحب نے استفسارات پیش کئے اور امداد حسین اخگر مراد آبادی اور مولوی محمد احمد خان ندوی نے بھی چند سوالات کئے۔ اس کے علاوہ اسد ملتانی کی اقبال سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ بعض ملاقاتوں کے کچھ حالات اُن کے ذہن میں محفوظ تھے۔ جیسا کہ انہوں نے خود لکھا ہے:

> ''حضرت علامہ سے بعض دوسری ملاقاتوں کے بھی کچھ حالات حافظے میں محفوظ ہیں۔ اگر کبھی توفیق ہوئی تو کاغذ پر منتقل کرنے کی کوشش کروں گا۔''[1]

یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ یہ حالات سپرد قلم ہوئے یا نہیں۔ اقبال سے رشتۂ تلمذ کے بعد اسد ملتانی نے فکرِ اقبال کی افہام وتفہیم کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا اور اُن کا کلام سمجھنے اور سمجھانے کو اپنی شاعری کا مقصد قرار دیا۔ اسد ملتانی کو اقبال کا کلام سمجھنے میں جب کوئی دشواری پیش آتی تو وہ اقبال سے رجوع کرتے تھے۔ مثال کے طور پر اُن کی مثنوی ''اسرارِ خودی'' کے مطالعے کے بعد اُن کے ذہن میں فلسفۂ خودی کے متعلق چند سوالات ابھرے اور اشعار میں ڈھل گئے۔ اقبال نے انہیں ہدایت کی کہ آپ میرے خطبات Reconstruction of Religious Thought in Islam کا مطالعہ کریں۔ اسد ملتانی نے ۱۹۳۴ء میں ''دُعا'' کے عنوان سے ایک نظم لکھی۔ یہ نظم ابھی شائع نہیں ہوئی تھی کہ

۱۔ طلوع اسلام، مئی ۱۹۴۱ء، بحوالہ اقبالیات اسد ملتانی (از جعفر بلوچ)، ص ۳۰۔

۱۹۳۶ء میں اقبال کی تصنیف ''ضربِ کلیم'' منظرِ عام پر آئی۔ اس میں درج اقبال کی نظم ''دُعا'' پڑھ کر اسد ملتانی کو ایسا محسوس ہوا جیسے ان کے خیالات کو اقبال نے مدِنظر رکھ کر ان کا جواب دیا ہے اور دُعا کے متعلق اُن کے نقطۂ نظر کی اصلاح کی ہے۔ یہ محض اتفاق تھا۔ اسد ملتانی کے بیان کے مطابق اقبال نے ''دعا'' ایک ایسے انداز میں کہی تھی جیسے یہ میری نظم کے جواب میں دُعا کے حقیقی فلسفہ کی تدریس و تفہیم تھی اور اقبال کی نظم کی اُٹھان سے ایسا لگتا تھا جیسے کسی کے استفسار کا جواب دیا جا رہا ہے۔ اسد ملتانی کی نظم کا یہ حصہ ملاحظہ کیجئے۔

اے دل تو ہی بتا کہ میں مانگوں خدا سے کیا — ہوتا ہی ہے جہاں میں ہماری رضا سے کیا
ہے زیست اپنے بس میں نہ موت اختیار میں — مطلب ہمیں پھر اپنی فنا و بقا سے کیا
طوفاں کا زور شور ہے دریا ہے موجزن — آب و ہوا کو آرزوئے ناخدا سے کیا
وقتِ معینہ پر خزاں آئے گی ضرور — ہوتا ہے عندلیب کے شورِ نوا سے کیا
اس کے سوا کہ دل کا نکل جائے کچھ غبار — ہوتا ہے غم نصیب کی آہ و بکا سے کیا
جو حلقۂ کمانِ قضا سے نکل چکا — رُک جائے گا وہ تیر مری التجا سے کیا

اسد ملتانی کو اقبال کے ساتھ اس قدر روحانی وابستگی تھی کہ وہ اُن کے انتقال کے بعد انہیں خواب میں دیکھتے تھے۔ اقبال خواب میں ان کے کلام پر اصلاح دیتے تھے۔ اُن کی رہنمائی کرتے تھے اور کئی مفید مشورے دیتے تھے۔ نظم ''بابر'' کے پیشِ نظر میں جناب اسد ملتانی کا یہ بیان ملاحظہ کیجئے:

''اس نظم کے آخری تین شعر ۴ جون کو موزون ہوئے۔ ۱۴ جون کی صبح کو خواب میں دیکھا کہ حضرت علامہ اقبال کسی جگہ ایک مجمع کے درمیان بیٹھے ہیں۔ میں حاضرِ خدمت ہوا تو فرمایا کہ کچھ تازہ اشعار لکھے ہیں تو سناؤ۔ میں نے عرض کیا کہ شہنشاہ بابر کے متعلق تین شعر کہے ہیں۔ لیکن نظم کی تکمیل کے لئے ابھی کچھ بھرتی کرنا باقی ہے۔ بھرتی کا لفظ سن کر میری طرف دیکھا اور فرمایا۔ بھرتی مجھے بالکل ناپسند ہے۔ غیر ضروری شعر

کبھی نہ کہا کرو۔ مگر وہ تین شعر کون سے ہیں۔ میں نے پہلا شعر سنایا۔

ایں نکتہ وا نمود بدستِ جہاں کشا　　حد وطن فضائے زمیں را کنارہ نیست

فرمانے لگے، یہ شعر خوب ہے۔ مجھے بہت پسند آیا ہے۔ اس کے بعد جب میں نے دوسرے شعر کا پہلا مصرعہ پڑھا کہ

مانازمی کنیم بہ ذاتش و لے چہ سود؟

تو ٹوک کر پوچھا۔ کیا کہا؟

مانازمی کنیم بیادش و لے چہ سود؟

میں نے دہرایا تو خاموش ہو گئے۔ ساتھ ہی فرمایا کہ یہاں کچھ اصحاب ایسے موجود ہیں جو فارسی نہیں سمجھتے۔ اس لیے شعروں کا مطلب اردو میں بھی ساتھ ساتھ بیان کرتے جاؤ۔ میں نے تعمیل کی۔ تین شعر ختم ہوئے تو آنکھ کھل گئی۔ جاگ اُٹھنے پر خواب کی پوری پوری کیفیت ذہن میں تھی۔ جب میں نے ''بہ ذاتش کی جگہ'' ''بیادش'' کے اشارہ پر غور کیا تو یہ ایک عمدہ اصلاح نظر آئی۔ چنانچہ میں نے شعر میں اسی کے مطابق ترمیم کر دی۔ اس خواب کے متعلق یہ امور قابلِ ذکر ہیں کہ ایک تو حضرت علامہ کی وفات کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے اُنہیں خواب میں دیکھا۔ دوسرے جس شعر میں اصلاح ہوئی ہے، اُسے میں اپنی طرف سے بالکل مکمل کر چکا تھا اور میرے ذہن میں اس کی اصلاح یا ترمیم کا کوئی خیال نہ تھا۔''[1]

جب ۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو دی انٹر کالجیٹ مسلم بورڈنگ ہاؤس کے زیر اہتمام یوم اقبال منایا گیا تو اس میں دیگر علم دوست احباب کے علاوہ اسد ملتانی نے بھی شرکت کی اور اقبال پر ایک نظم سنائی۔ جس کی ابتداء یوں ہوتی ہے۔

شاعروں سے ہے بہت اونچا مقام اقبال کا　　کیونکہ ہم آہنگ قرآن ہے کلام اقبال کا

۱۔ ماہنامہ طلوعِ اسلام، اگست ۱۹۳۹ء، بحوالہ اقبالیات اسد ملتانی (از جعفر بلوچ)، ص ۳۲۔۳۳۔

''اقبالیات اسد ملتانی'' میں اقبال پر اسدؔ ملتانی کی سولہ نظمیں ہیں۔ سوال بہ اقبال، اقبال، مرثیۂ اقبال، غمِ اقبال، مقصودِ اقبال، شعرِ اقبال، جناح و اقبال، کارنامۂ اقبال، یومِ اقبال، کلام اقبال کا انگریزی ترجمہ، پیغامِ اقبال، عصر اقبال، پیغام اقبال اور ہم، اقبال سے سوال، اور سیرت اقبال۔ یہ نظمیں اقبال سے اسد ملتانی کے جذبات اور وجدانی اتحاد کی مظہر اور ایک لازوال تاثر کی حامل ہیں۔

اقبال بھی اسدؔ ملتانی کی صلاحیتوں سے واقف تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے یہ توقع ظاہر کی تھی کہ آئندہ پنجاب کی ادبی روایات رکھے جانے کی امیدیں دو نوجوانوں سے وابستہ نظر آتی ہیں۔ ایک تاثیر اور دوسرے محمد اسد خان۔[1]

اقبال کا جو بنیادی مشن تھا اسد ملتانی اس کی ترویج و تبلیغ کے لئے کوشاں تھے۔ اور بعض اوقات ان کی شاعری کا مقصد ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اقبال کے نورِ بصیرت اور سوزِ عشق کو عام کرنا چاہتے ہیں اور اُن کی کامیاب ترین نظمیں فیضانِ اقبال کا نتیجہ ہیں۔ خودی، جبر و قدر، عقل و عشق، فقر، تصوف، فلسفۂ حرکت و عمل، فرنگی تہذیب، سیاسی مسائل، آزادیٔ نسواں اقبال کے مختلف موضوعات ہیں۔ ان تمام پہلوؤں پر اسدؔ ملتانی نے اقبال کی ہمنوائی کر کے اپنے انداز میں ان پر طبع آزمائی کی ہے۔ اجتماعیت، اتحاد پر زور، اشتراکیت اور جمہوریت کی مخالفت، عمل کے فروغ کے لئے عشق کو عقل پر ترجیح دینا، عورت کی بے حجابی پر ردعمل، تصورِ فقر اور صوفیا کی بے عملی، ان تمام پہلوؤں پر اقبال نے اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں۔ اسدؔ ملتانی نے بھی ان تمام پہلوؤں پر اقبال کی ہمنوائی کی ہے۔ مثال کے طور پر بے حجابیٔ نسواں پر وہ یوں کڑھتے ہیں ؎

جب اختلاطِ زن و مرد عام ہو جائے　　تو ٹوٹ جاتی ہیں جذب و کشش کی زنجیریں

اقبال نے صوفیاء کی بے عملی پر اعتراض کیا ہے۔ اسد ملتانی بھی صوفیاء کے اصلی کردار کے ختم ہونے پر یوں نالاں ہیں ؎

۱۔ محمود نظامی (مرتب) ملفوظاتِ اقبال، ص ۲۶۹۔

نہ رہا اہل تصوف میں بھی کچھ جذب و اثر اب وہاں وجہ کشش نغمۂ قوالی ہے

اقبال نے پیر رومی اور مرید ہندی کے زیر عنوان ایک مکالماتی نظم لکھی ہے۔ اسد ملتانی نے بھی 'سوال بہ اقبال' کے زیر عنوان ایک نظم لکھی۔ اس میں اقبال کی طرز پر اُن سے (اقبال سے) خیالی گفتگو کی گئی ہے اور اُن کے کلام سے عصری مسائل کا حل تلاش کیا گیا ہے۔ اس نظم میں بقول جعفر بلوچ "مقامِ عقل، وصلِ یزداں، امامتِ اقوام کے سلسلے میں مسلمانوں کی ناکامی، فرنگ سے استفادہ، خود کفالتی اور غایتِ دینِ مبین کے متعلق سوال کر کے اقبال کے کلام سے جواب فراہم کیا گیا ہے۔ کبھی اقبال کی طرز پر بہشت میں اقبال و جناح کو ملاقی کراتے ہیں اور تبادلۂ تبریک کے بعد اقبال کی زبان سے پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کے خواہاں نظر آتے ہیں۔

اسد ملتانی کی غزلوں اور نظموں میں اقبال کا رنگ واضح طور پر جھلکتا ہے۔ انہوں نے شعر میں حضرت اقبال کے پیرو ہونے کا خود بھی اعتراف کیا ہے

شعر میں حضرت اقبال کا پیرو ہونا ہے اگر جرم تو بے شک اسد اقبالی ہے

اقبال کی پیروی پر انہیں سدا فخر رہا۔ ذیل میں اُن کی غزلوں کے چند نمونے ملاحظہ کیجئے۔

رہیں نہ رند، یہ زاہد کے بس کی بات نہیں تمام شہر ہے دو چار، دس کی بات نہیں

دے کر تپشِ الفت گرما دئے دل کتنے زاہد کی بزرگی سے اُس بت کا شباب اچھا

اے حسن محبت بھی طالب ہے تلون کی اک وقت خطاب اچھا، اک وقت عتاب اچھا

چند نمونے اُن کی نظموں سے بھی پیش ہیں۔

ابھی تک کافری سے عقل ایماں تک نہیں پہنچی کہیں دیر و حرم کے درمیاں معلوم ہوتی ہے

زاہد شعور حسن سے بیگانہ ہی رہا حسنِ نظر نہیں ہے تو حسنِ عمل کہاں

کی مسلمان نے ترقی جو فرنگی بن کر وہ فرنگی کی ترقی ہے مسلمان کی نہیں

ہر شخص بنالیتا ہے اخلاق کا معیار خود اپنے لئے اور زمانے کے لئے اور

اسد ملتانی اقبال کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے عصرِ حاضر کو عصرِ اقبال قرار

دیتے ہیں۔ انہیں اس بات سے شدید اذیت ہوتی ہے کہ قوم پیغام اقبال کو فراموش کرتی جارہی ہے۔ اگر اقبال کے فرمودات پر اقرار ہوتا بھی ہے تو صرف زبان کی حد تک، مگر دل اس کی تصدیق نہیں کرتے۔ اور عمل اس کی تائید سے قاصر ہے۔ ''پیغام اقبال اور ہم'' میں وہ اس تلخ حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ تمدن، شہریت، ذوق، سیاست، غرض ہر شعبے میں ہمارا عمل کلامِ اقبال کے برخلاف ہے۔ اُن کی نظم ''یومِ اقبال'' اقبال فراموشی کے خلاف ایک صدائے احتجاج کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نظم کے متعلق جعفر بلوچ رقم طراز ہیں:

> ''یہ نظم طنز و طعن اور احتساب و مواخذہ کا عجیب امتزاج ہے۔ شاعر کے وفورِ اشتعال نے ہر مصرع کو شمشیر برّاں بنادیا ہے۔ فرطِ غیظ میں ہر حرف نیزے کی انی بن کر دلوں کو چھیدتا ہے۔ یہ نظم پڑھتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ عرب کا مشہور شاعر متمّم بن نویرہ اپنے بھائی کے قتل کا انتقام لینے کے لئے پیچ و تاب کھا رہا ہے۔''[1]

اسد ملتانی نے اقبال کے متعلق نظموں میں اُن کی شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ کبھی وہ عام غزل گوؤں اور اقبال کے مابین ایک خطِ امتیاز کھینچ کر غزل گوئی میں اُن کے کمال کا اعتراف کرتے ہیں۔ کبھی اُن کے انتقال سے پیدا شدہ خلا کا ذکر کرتے ہیں۔ ''یادِ اقبال'' میں اقبال کے انتقال پر اس طرح رنج و غم کا اظہار کیا گیا ہے۔

نہیں اُٹھتی کوئی پر درد صدا تیرے بعد — ہوگیا قافلہ محروم درا تیرے بعد
نہ رہا عقل و جنوں میں وہ توازن قائم — علم پھر عشق سے بیگانہ ہوا تیرے بعد
غلطی پر جو کوئی ٹوکنے والا نہ رہا — کھو گئے بولہبی میں علماء تیرے بعد

اسد ملتانی کے کلام کے مطالعے سے اُن کے نظریۂ فن کا پتہ چلتا ہے۔ اُن کا نظریۂ فن اقبال کے نظریۂ فن سے بہت حد تک مماثل معلوم ہوتا ہے۔ وہ شاعری میں کسی الجھاؤ کے قائل نہیں بلکہ اظہار و ابلاغ میں راست تخاطب کو لازم گردانتے ہیں۔ اُن کے نزدیک

۱۔ جعفر بلوچ، اقبالیاتِ اسد ملتانی۔ ص ۴۰۔

قاری کو بیدار کرنے والی شاعری عظیم شاعری ہے اور وہ شاعری مردود ہے جس کی بنیاد دین سے بیزاری، بے ادبی، عریانی، ہوس پرستی اور تقلید فرنگ پر رکھی گئی ہو۔ انہوں نے اپنی دو نظموں ''میعار شعر و ادب'' اور ''نیا ادب'' میں اپنے نظریۂ فن کا اظہار کیا ہے۔ وہ جعفر بلوچ کے الفاظ میں ''مذاق سلیم، حیات انگیزی، دلکشائی، عام فہمی، پاکیزگیٔ مضمون، سوز و گداز اور خلائق کے لئے فایدہ رسانی کو صحیح ادب کے لوازم قرار دیتے ہیں۔

اسد ملتانی نے کئی شعراء مثلاً حافظ، صائب، غالب، اکبر کے اشعار کی تضمین کرنے کے علاوہ اقبال کی ایک نظم ''ترکی اور مجلس یورپ'' میں اُن کے اس شعر پر تضمین کی ہے ؎

سمجھ رہے ہیں وہ یورپ کو ہم جوار اپنا ستارے جن کے نشیمن سے ہیں زیادہ قریب

اسد ملتانی نے ''مرثیہ اقبال'' کے عنوان سے اقبال کی رحلت پر ایک دردانگیز مرثیہ لکھا ہے جو اقبال کی وفات کے فوراً بعد کتابی صورت میں شائع ہوا۔ اس میں اقبال کو امامِ فلسفہ و شاعری، پیغمبر بہار، نوائے فطرت پر غالب آنے والا زمزمہ پرداز، شاعرِ حیات، آفتابِ مشرق، ترجمان حقیقت جیسے القاب سے یاد کیا گیا ہے اور اُن کی خدمات اور حیثیات کا اعتراف کیا گیا ہے۔ اس مرثیہ کا دیباچہ ''چند الفاظ'' کے عنوان سے چودھری غلام احمد پرویز نے لکھا ہے۔ موصوف ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''اقبال کا مرثیہ درحقیقت عالمِ اسلامی کی بے کسی اور یتیمی کا مرثیہ ہے اور اسے وہی شخص لکھ سکتا تھا جس کی انگلیاں نبض ملت پر اور نگاہیں رفتارِ زمانہ پر ہوں جس کا دماغ حقائق قرآنی سے منور اور قلب دردِ ملّی سے لبریز ہو۔ یہ توفیق حلقۂ اقبال ہی کے کسی رندِ سرشار کا حصہ تھی اور ظاہر ہے کہ جناب اسد سے بڑھ کر اس سعادت کا مستحق اور کون ہو سکتا تھا۔''[1]

اقبال نے انسان کو حرکت و عمل اور سعی پیہم کی رہ رہ کر تلقین کی ہے۔ اسد ملتانی نے

۱۔ مرثیۂ اقبال۔ ص ۴۔۵، بحوالہ اقبالیات اسد ملتانی (از جعفر بلوچ)، ص ۳۷

بھی اقبال کے اثرات کے تحت انسان کو حرکت و عمل کا پیغام دیا ہے اور مرثیہ کو نعرۂ جہاد میں ڈھالا ہے۔

اٹھو مقابلۂ گردش زمانہ کریں　　حیات و موت کو پابستہ قضا نہ کریں
عجب نہیں کہ یہی بجلیاں حوادث کی　　ہمارے تو سن ہمت کو تازیانہ کریں
نہ مل سکا طب نیم گرم سے کچھ بھی　　اب ایک بار تقاضائے والہانہ کریں
اسی سے ملّت خوابیدہ جاگ اٹھے شاید　　وطن میں عام پھر اقبال کا ترانہ کریں

مثنوی اسرارِ خودی کے دو ترجمے: ایک مطالعہ

حکیم الامت علامہ محمد اقبال ایک عظیم مفکر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ایسے الہام نوا شاعر تھے جنہوں نے نہ صرف مسلمانوں بلکہ پورے بنی نوع انسان کو اپنے حیات بخش پیغام سے نوازا۔ اُن کے احساس کمتری کو دور کر کے اُن میں خودی اور خودداری کا جذبہ بیدار کیا۔ عمل سے غافل قوم کو سعی پیہم کا درس دیا۔ زندگی کے اُن اہم اور بنیادی حقائق کو شاعری کا موضوع بنایا جو قوموں اور جماعتوں کی سیرت و کردار کی تعمیر و تشکیل میں معاون ثابت ہو کر ہمرہان سست عناصر کو منزل مقصود کی جانب تیز گام ہونا سکھاتی ہیں۔ اقبال کی آواز میں ایک خاص قسم کی تاثیر ہے اور یہ بات فطری ہے کہ جو بات دل سے نکلتی ہے وہ تاثیر سے معمور ہوتی ہے۔

خودی کا تصور اقبال کی شاعری کا اساسی اور مرکزی تصور ہے۔ لفظ خودی اقبال سے پہلے اور اُن کے دور میں بھی استعمال ہوتا رہا ہے۔ لیکن اسے اُردو اور فارسی میں تکبر، غرور اور نخوت کے منفی معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ اقبال نے اس لفظ کو قرآن کے تناظر میں استعمال کیا ہے بلکہ اس کا سنگِ بنیاد قرآن حکیم کی سورۃ المائدہ کی آیت نمبر ۱۰۵[1] پر رکھا گیا ہے، جس میں اہلِ ایمان پر خودی کی حفاظت فرض قرار دی گئی ہے۔ اقبال کے نزدیک خودی

۱۔ یا ایھاالذین اٰمنو علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اھتدیتم الی اللہ مرجعکم جمیعا فینبئکم بما کنتم تعملون۔

ترجمہ: اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، تم پر فرض ہے خودی کی حفاظت، اگر تم ہدایت پر ہو تو وہ شخص جو گمراہ ہے، تمہیں کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا۔ تم سمجھو کہ اللہ ہی کے پاس واپس جانا ہے اور وہ تمہیں تمہارے اعمال پر مطلع کر دے گا۔ (تا کہ ان کے مطابق جزا و سزا مل سکے۔)

سے عرفان نفس یا عرفان ذات مراد ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی استعداد سے نوازا ہے اس لئے اس پر لازم ہے کہ وہ اپنی اس استعداد کو اُجاگر کر کے مثبت طور پر بروئے کار لائے۔ خودی قانونِ الٰہی کی پابند ہو۔ اقبال خودی کی اصطلاح پر شروع سے غور و فکر کرتے رہے ہیں۔ اور اس کا باقاعدہ طور پر اُن کے یہاں ارتقاء ہوا ہے۔ چنانچہ ۱۹۱۵ء میں ''اسرارِ خودی'' کے نام سے اُن کی فارسی مثنوی شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔ یہ مثنوی اقبال کے سالہا سال کے غور و فکر اور بعض بے خواب راتوں کا نتیجہ ہے۔ اُنہیں باقاعدہ طور پر اپنے پیر و مرشد مولانا جلال الدین رومی سے اسے لکھنے کی ہدایت ہوئی ہے جیسا کہ مثنوی کے مطالعہ سے اس بات کا ثبوت بھی فراہم ہوتا ہے۔ مثنوی اسرارِ خودی میں اقبال کے مجتہدانہ افکار کی کارفرمائی ہے، اس لئے اس کی صوفیانہ حلقوں میں خاصی مخالفت ہوئی تاہم مرور ایام کے ساتھ ساتھ اس کی اہمیت کو سمجھا جانے لگا۔ کیمبرج یونیورسٹی کے عربی کے پروفیسر اور مشہور مستشرق پروفیسر رینالڈ اے نکلسن نے اقبال سے اجازت حاصل کر کے اس مثنوی کا انگریزی ترجمہ " Secrets of the Self " کے نام سے کیا جو ۱۹۲۰ء میں شائع ہو کر منظرِ عام پر آیا۔ پروفیسر موصوف سے اقبال کی ملاقات طالب علمی کے زمانے میں کیمبرج میں ہوئی تھی اور اُنہوں نے اقبال کے شاندار مستقبل کا اُسی زمانے میں اندازہ لگا لیا تھا۔ جیسا کہ ملک حسن اختر گفتار اقبال کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

> ''میں آج سے تقریباً پچیس برس قبل اقبال سے کیمبرج میں ملا تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں کوئی شخص کسی نوجوان کے شاندار مستقبل اور آئندہ حاصل ہونے والی عزت و شہرت کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ مگر ڈاکٹر اقبال کے متعلق اس وقت بھی یقین تھا کہ وہ بڑے مرتبے پر پہنچیں گے۔ یہ فلسفے کے دقیق مسائل اور حقائق کو نہایت دلکش اور دلفریب اشعار میں پیش کرتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ ایک خاص پیغام پہنچا رہے ہیں جس میں روحانیت کا پہلو غالب ہے۔''[1]

۱۔ ملک حسن اختر، دائرہ معارف اقبال، ص ۵۱۹۔

پروفیسر نکلسن عربی اور فارسی کے مستند عالم ہیں۔ اُنہوں نے فارسی کے ممتاز شاعر مولانا جلال الدین رومی پر کافی کام کیا ہے۔ اُن کا ایک اہم کارنامہ مولانا کی آٹھ جلدوں پر مشتمل مثنوی کا انگریزی ترجمہ ہے جسے مطالعۂ رومی میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ پروفیسر موصوف[1] نے اپنی حیات کا ایک کثیر حصہ اسلامی تصوف کے مطالعے میں صرف کیا ہے، عربی فارسی اور ترکی کے گہرے مطالعے کے نتیجے میں وہ ان زبانوں میں پائے جانے والے صوفیانہ ادب کا ترجمہ کرنے کے ہنر سے بہت حد تک بہرہ مند ہیں۔ جہاں تک پروفیسر نکلسن کے یہاں فارسی مثنوی اسرارِ خودی کی تفہیم کا تعلق ہے، اس میں اُنہیں اپنے ایک قریبی دوست اور لاہور کے عربی کے پروفیسر محمد شفیع نامی کی ان معنوں میں معاونت شامل حال رہی ہے کہ مطالعے کے دوران پیش آنے والی مشکلات سے متعلق وہ پروفیسر موصوف سے بحث ومباحثہ کرتے۔ پروفیسر نکلسن کی گوناگوں علمی اور ادبی مصروفیات کے باعث اسرار خودی کے ترجمہ کا کام بیچ میں کافی دنوں تک التواء میں پڑا رہا۔ بالآخر یہ ۱۹۲۰ء میں "Secrets of the Self" کے نام سے شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ ترجمے کی ابتداء میں فاضل مترجم کا تحریر کردہ سترہ صفحات پر مشتمل ایک عالمانہ تعارف بھی درج ہے جس میں کتاب کے مصنف اور مثنوی کے حوالے سے کئی اہم نکات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پروفیسر موصوف اقبال کو ایک ہندی مسلمان قرار دیتے ہوئے بتاتے ہیں کہ اقبال نے قیام مغرب کے دوران جدید فلسفے کا مطالعہ کیا اور ۱۹۰۸ء میں ان کا تحقیقی مقالہ بعنوان The Development of Metaphysics in Persia[2] (ایران میں مابعد الطبعیات کا ارتقاء) کتابی شکل میں منصۂ شہود پر آیا۔ پروفیسر نکلسن کے نزدیک یہیں سے اقبال کے یہاں ایک مخصوص فلسفہ ارتقاء پذیر ہوتا رہا۔ ہندو فلسفی خدا اور کائنات کی وحدت کے عقیدے کے قائل ہیں۔ اقبال کے نزدیک ہندی اور ایرانی صوفیاء میں سے اکثر نے مسئلہ فنا کی تفسیر فلسفۂ ویدانت اور بدھ مت کے زیر اثر کی ہے جس کے نتیجے میں مسلمان اس وقت

۱۔ پروفیسر نکلسن نے ''لٹریری ہسٹری آف دی عربس'' کے نام سے بھی ایک کتاب لکھی ہے۔

۲۔ اس مقالے پر اقبال کو میونخ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی۔

ناکارہ محض ہے۔ اُن کے عقیدے کی رُو سے یہ تفسیر بغداد کی تباہی سے بھی زیادہ خطرناک تھی اور ایک معنی میں اُنہوں نے اپنی تمام تحریروں کو اسی تفسیر کے خلاف ایک قسم کی بغاوت قرار دیا ہے۔ اقبال خدا کی وحدانیت کے قائل ہونے کے ساتھ ساتھ انسان کے انفرادی وجود کو برقرار رکھنے پر بھی خاصا زور دیتے ہیں، ان کے نزدیک انسان اُسی بحرِ بے بیکراں کا ایک قطرہ ہے لیکن وہ اس بحرِ بیکراں کے ساتھ مل کر اُس کے ضم ہو جانے کے قائل نہیں بلکہ اُسی کو اپنے اندر ضم کر دینے کے قائل ہیں۔ اسی طرح اقبال اگر مسلمانوں کے شاعر ہیں لیکن اُن کا پیغام ہندوستانی مسلمانوں تک ہی محدود نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ پروفیسر نکلسن کے نزدیک اقبال نے یورپی ادب کا گہرا مطالعہ کرنے ساتھ ساتھ مغربی مفکرین نطشے اور برگسان سے بھی بہت کچھ اخذ و اکتساب کیا ہے۔ اُن کے مطابق اقبال کی شاعری بسا اوقات انگریزی کے رومانی شاعر شیلے کی یاد دلاتی ہے لیکن ان اثرات کے باوجود اُن کا اندازِ فکر اور اُن کے محسوسات ایک مسلمان کے ہیں۔ اسی سبب کے تحت اُن کے دائرہ اثر میں وسعت پائی جاتی ہے۔ مذہب سے اُنہیں گہرا شغف ہے۔ اور وہ ایک ایسی ریاست کے متمنی ہیں جس میں فقط خدائے واحد کی حکومت ہو اور جس میں تمام مسلمان نسلی اور ملکی امتیازات سے بالاتر ہوں۔ وہ نیشنلزم اور شاہی حکومت (imperialism) میں ہرگز یقین نہیں رکھتے، کیونکہ اس نوع کی حکومتیں مسلمان کے لئے جنت کی راہ میں رہزن کا کام کرتی ہیں، لوگوں کو باہم دگر اجنبی بنا دیتی ہیں، اخوت کے جذبے کو تباہ کر کے جنگ کے بیج بوتی ہیں۔ اقبال ایک ایسی دنیا کا خواب دیکھتے ہیں جس میں سیاست کی نہیں، مذہب کی حکمرانی ہو، چنانچہ وہ مشہور سیاسی مفکر میکاولی جیسے جعلی خداؤں کے پرستار کو مذموم قرار دیتے ہیں، جنہوں نے نہ جانے کتنے لوگوں کو اندھا کر دیا ہے۔ نکلسن کے نزدیک مذہب سے اقبال کی مراد اسلام سے ہے۔ جہاد فقط فی سبیل اللہ کیا جائے، اقبال ایک ایسے مسلم بھائی چارہ کے خواہاں ہیں جس کا مرکز کعبۃ اللہ ہو اور جس میں خدا کی محبت اور عشقِ محمدیؐ اور آپؐ کی اتباع پر زور ہو۔ اسرار خودی اور رموز بے خودی

دونوں میں انہیں عناصر کی بڑے خلوص کے ساتھ تلقین کی گئی ہے۔ اقبال نے اس کے حصول کے طریقے بھی بتادئے ہیں۔ اسرارخودی فرد کی زندگی اور رموز بے خودی جماعت کی زندگی سے بحث کرتی ہے۔ اقبال کے یہاں فلسفہ مذہب کی لونڈی نہیں۔ ایک مثالی معاشرہ حضورؐ کے نظریۂ اسلام پر عمل پیرا ہونے سے ہی قائم کیا جاسکتا ہے اور اس میں ہر فرد خودکو زیادہ سے زیادہ کامل بنانے کے لئے جدوجہد کرے اور وہ خدا کی اس بستی پر اسلامی سلطنت قائم کرنے میں معاون ثابت ہو۔

پروفیسر نکلسن کے نزدیک اقبال حافظؔ شیرازی کے پیش کئے گئے طریقۂ تصوف کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ وہ اپنے روحانی پیرومرشد مولانا جلال الدین رومی کو خراج عقیدت پیش کرنے کے باوجود اُن کے نفس کشی (Self abandonment) کے نظریے سے انحراف کرتے ہیں، اور وہ اُن کے خدا اور انسان کے ایک ہونے کے عقیدہ کے قائل نہیں۔

پروفیسر نکلسن نے اقبال سے اس مثنوی میں پیش کئے گئے مسائل کی نسبت اُن کی فلسفیانہ آراء سے متعلق ایک بیان تحریر کرنے کی گزارش تھی، جس کے نتیجے میں اقبال نے عجلت میں جو بیانات تحریر کئے اُنہیں پروفیسر نکلسن نے اسرارِ خودی کے ترجمے کی ابتداء میں تعارف کے اختتام پر درج کیا ہے۔ یہ بیانات اسرارخودی کی فلسفیانہ اساس، انا اور شخصیت کا تسلسل (continuation) اور انا کی تربیت پر مشتمل ہیں۔

ترجمے کے دوران مترجم نے فٹ نوٹ بھی دئے ہیں جن میں بعض اہم اصطلاحات، الفاظ اور تصورات کی وضاحت کردی گئی ہے۔ ترجمے کے آخر میں ڈاکٹر ملک راج آنند کا تحریر کیا ہوا مقالہ "The Humanism of Iqbal" کے عنوان سے درج ہے۔

اسرارِ خودی کا ترجمہ کرتے ہوئے پروفیسر نکلسن کی اس آواز نے سب کو چونکا دیا کہ یہ مثنوی زبردست آواز ہے جو مسلمانوں کو محمدؐ اور قرآن کی طرف بلاتی ہے اور اس آواز میں جو سوز صداقت ہے اُس کی ہم تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

"The cry, back to Koran, back to Mohammad" has been heard before and the responses have hitherto

been somewhat discouraging. But on this occasion it is allied with the revolutionary force of Western philosophy, which Iqbal hopes and believes will vitalise the movement and ensure its triumph".[1]

نکلسن کے ترجمے میں اقبال کے دیرینہ خواب کی تعبیر سامنے آئی اور اُن کی شب و روز کی محنت بارآور ثابت ہوئی، چنانچہ اُنہوں نے ایک عجیب طرح کی حیرت زا شکایت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ مثنوی جن لوگوں کے لئے لکھی گئی تھی وہ ٹھیک سے اس کے مفہوم کی تہہ تک نہ پہنچے، اور نہ اس پیغام کو سنتے ہیں۔ مگر جن لوگوں سے اس مثنوی میں خطاب ہی نہیں کیا گیا وہ اسے سمجھ گئے ہیں تاہم اقبال پر کئی کتابوں کے مصنف[2] اور انگریزی ادب کے ایک اُستاد پروفیسر غلام رسول ملک نے اقبال پر تحریر کئے گئے اپنے ایک مقالے بعنوان "The Western Response to Iqbal-- An Overview" میں اقبال کے تئیں مغرب میں پائے جانے والے رویے پر اظہار خیال کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اقبال کی بحیثیت شاعر اور مفکر شعوری اور معروضی تعین قدر سے زیادہ اس میں غیر شعوری مقاصد کارفرما رہے ہیں۔ مقالے میں اقبال کے کئی مترجمین جیسے آربری، ایلیہ سینڈروبوزانی، این، میری، شمل کے علاوہ پروفیسر نکلسن کا بھی ذکر آیا ہے۔ پروفیسر نکلسن کے ترجمۂ اسرار خودی " Secrets of the Self " کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ موصوف نے کئی مقامات پر اقبال کے اشعار کا غلط ترجمہ کیا ہے۔ اس ضمن میں جن اشعار کے حوالے دئے جا چکے ہیں، وہ ذیل میں درج ہیں۔

در دماغش نادمیدہ لالہ ہا　　ناشنیدہ نغمہ ہا ہم نالہ ہا
از رموز زندگی آگاہ شو　　ظالم و جاہل ز غیر اللہ شو
باتوانائی صداقت توأم است　　گر خود آگاہی ہمیں جام جم است

---

1. Prof. R.A. Nicholson (translator) Secrets of the self, p. 12.

۲۔ اے سٹیڈی آف اقبالز ریسپانس ٹو دی ویسٹ، اقبال اینڈ دی انگلش رومنٹکس، بلڈی ہورائزن اور سرودِ سحر آفرین۔

اول الذکر شعر اُس درس یا مکالمے کا جزو ہے جس میں اقبال نے ایک آئیڈیل (آدرش) شاعر کا تذکرہ کیا ہے، جن کی خود اپنی حیثیت حسن کے کم یا خالی نہ ہونے والے سرچشمے کی ہے۔ پروفیسر ملک نے اس شعر کا صحیح ترجمہ بھی تجویز کیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے

"In his mind exist tulips yet unbloomed And unheard
melodies of joy and pain"

جب کہ پروفیسر نکلسن نے اس شعر کا ترجمہ کرتے ہوئے اسے قطعی طور بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔

Era tulips bloomed in his brain
There was heard no note of joy and grief.

جن اشعار کا غلط ترجمہ کیا گیا ہے، اُن کی وجہ سے کافی اُلجھن پیدا ہو چکی ہے اور وہ شاعر کی طرف سے پیش کئے گئے بنیادی یا اصل خیال یا مقصد سے بہت دور ہو کر قارئین کے ذہنوں میں عجیب تاثر پیدا کر دیتے ہیں۔ پروفیسر نکلسن نے اقبال کے اس شعر ؎

از رموز زندگی آگاہ شو ظالم و جاہل ز غیر اللہ شو

کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا ہے ؎

Gain knowledge of life's mysteries.
Be a tyrant. Ignore all except God.

جب کہ پروفیسر ملک اس شعر کا ترجمہ اس طرح تجویز کرتے ہیں:

Gain access to the mysteries of life.
Be cruel and impervious to all, other than God.

پروفیسر ملک نے نکلسن کے مذکورہ تراجم کے پیش نظر انہیں ترجمہ کی بجائے مذاق سے تعبیر کیا ہے۔ پروفیسر موصوف نے اس بات پر زبردست استعجاب کا اظہار کیا ہے کہ نکلسن نے ترجمہ میں بڑی آسانی کے ساتھ واؤ عطف کو گرا دیا ہے اور شعر کے مصرعۂ ثانی کا جو مفہوم پیش کیا ہے وہ کسی بھی اعتبار سے شاعر کے اصل خیال سے مطابقت نہیں رکھتا۔ ان غلطیوں سے قطع نظر کر کے، جن کی نشاندہی پروفیسر ملک نے اپنے مقالے میں کی ہے، کے علاوہ بھی نکلسن کے ترجمہ میں عدم صحت کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر اسرارِ خودی کے اس شعر ؎

شاعری زیں مثنوی مقصود نیست بت پرستی، بت گری، مقصود نیست

کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے:

Poetising is not the aim of this Masnavi.
Beauty- worshipping and love making is not its aim.

پروفیسر نکلسن کے بعد اسرارِ خودی کے انگریزی زبان میں ہی اور بھی کئی ترجمے کئے گئے جن میں جناب عبدالرحمان طارق اور جناب مقبول الٰہی کے ترجمے شامل ہیں، اول الذکر ترجمہ نثر میں کیا گیا ہے جب کہ آخر الذکر ترجمہ منظوم ہے۔ پروفیسر نکلسن کے ترجمے کا ان دوسرے تراجم سے جب موازنہ کیا جاتا ہے تو بعض مقامات پر یہ نکلسن کے ترجمے سے بہتر معلوم ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر جناب عبدالرحمان طارق مذکورہ بالا شعر کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں:

poetising is not the aim of this Mathnavi.
Idol making and idol-worshipping is not its object

اب ذیل میں جناب مقبول الٰہی کا اسی شعر کا کیا ہوا ترجمہ ملاحظہ کیجئے:

Mere poetry, of this Mathnavi is not all the aim.
Creating idols for worship is far-thest from its claim.

جناب مقبول الٰہی کے ترجمہ اسرارِ خودی کو منظوم ہونے کی بناء پر نکلسن کے ترجمے سے تعبیر قرار دیا گیا ہے، پروفیسر نکلسن کے ترجمے میں مذکورہ شعر کے مصرعۂ ثانی کا ترجمہ صحیح مفہوم کو ادا کرنے سے قاصر ہے۔ جب کہ جناب شیخ عبدالرحمان کے ترجمے سے اصل شعر کا مفہوم قاری پر مکمل طور سے واضح ہو جاتا ہے اور جناب مقبول الٰہی کے ترجمے کے چوتھے مصرعے میں claim لفظ کا ترجمہ صحیح نہیں مانا گیا ہے۔ پھر بھی موخر الذکر ترجمہ پہلے دو ترجموں کی نسبت بہتر قرار پایا ہے۔ اُس کی ایک وجہ اس کا منظوم ہونا بھی بتایا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ نثر کے مقابلے میں نظم قاری کو متاثر کرنے کی زیادہ اہلیت رکھتی ہے، بشرطیکہ کہنے والے نے خیال کی ترسیل اور ابلاغ میں صحت کے ساتھ تاثیر پیدا کر دی ہو، موخر الذکر ترجمہ کے بہتر ہونے میں کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیے کیونکہ جناب مقبول الٰہی کے سامنے پہلے سے دو ترجمے موجود تھے جن سے وہ خاطر خواہ استفادہ کر کے اپنے ترجمے کو زیادہ سے زیادہ بہتر بنا سکتے تھے۔ پروفیسر نکلسن کو بعض مقامات پر خود بھی مثنوی کے اصل اشعار کے مفہوم اور

ترجمے کی مطابقت اور ہم آہنگی کے نہ ہونے کا احساس بھی رہا ہے چنانچہ اُنہوں نے ترجمے کی تمہید میں اس نوع کی کوتاہیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

"I am not sure that I have always grasped the meaning or rendered it correctly; but I hope that such errors are few."[1]

پروفیسر نکلسن کے اس ترجمے کو افکارِ اقبال کی تفہیم کی شاندار عمارت کی تعمیر کے سلسلہ میں خشت اول کی حیثیت حاصل ہونی چاہیے، یا اسے بارش کے پہلے قطرہ سے تعبیر کیا جائے۔ دراصل کسی مہم کو سر کرنے کی خاطر اس کی جانب بڑھنے والا پہلا قدم یا کسی اہم کام کا بیڑا اُٹھانا اور پھر اسے تکمیل تک پہنچانا نہ صرف تاریخی اہمیت کا حامل ہوتا ہے بلکہ اور بھی اعتبار سے اس کی بڑی اہمیت ہوتی ہے جسے کسی بھی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ترجمہ اپنی بعض خامیوں کے باوجود اقبال کی طرف مشرق اور مغرب کی توجہ دلانے میں ٹرننگ پوائنٹ (Turning point) ثابت ہوا۔ اس ترجمے کی بدولت اقبال نہ صرف یورپ اور امریکہ کے ممالک سے متعارف ہوئے بلکہ اُن کی شہرت کافی دور دور تک پھیل گئی۔ مثنوی پر کئی تبصرے کئے گئے جو اس کی مخالفت اور موافقت دونوں میں تھے۔ بعض تبصرہ نگاروں نے اگرچہ اقبال کے افکار کو اپنے صحیح سیاق وسباق میں نہ سمجھتے ہوئے اُن پر کئی طرح کے اعتراضات عائد کئے، مثال کے طور پر کیمبرج یونیورسٹی کے فلسفہ کے پروفیسر ڈکنسن نے ترجمۂ اسرارِ خودی Secrets of the self پر تبصرہ کرتے ہوئے اقبال کے اسلامی افکار کو فرقہ پرستی سے تعبیر کرتے ہوئے اُن پر قوم پرستی کا الزام عائد کیا۔ اسی طرح اقبال کے فلسفۂ سخت کوشی پر اعتراض کیا گیا، تاہم اقبال نے ان تمام اعتراضات کے جوابات پروفیسر نکلسن کے نام تحریر کئے گئے ایک طویل مکتوب میں دئے جو اُس زمانے کے مشہور رسالہ "Quest" میں شائع ہوا اور بعد میں اس کا ترجمہ رسالہ معارف (اعظم گڈھ) کے اکتوبر ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا۔ یہ خط اقبال نامہ حصۂ اول مرتبہ شیخ عطاء اللہ کے آخر میں درج ہے۔ اقبال نے ان اعتراضات کے جوابات نہایت ہی منطقی استدلال کے

---

1. R.A. Nicholson, Secrets of the self, p. 14.

ساتھ دیئے ہیں۔ بہرحال اگر پروفیسر نکلسن بروقت اقبال کی اس اجتہادی تصنیف کی طرف متوجہ نہ ہوتے تو نہ جانے کب تک اقبال کی یہ تصنیف قارئین کی عدم توجہی کا باعث بنی رہتی اور وہ اقبال کے گرانقدر افکار سے محروم رہ جاتے۔ یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ اسرارِ خودی پر آئندہ مثبت کام اور انگریزی کے علاوہ کئی دوسری زبانوں میں اس کے تراجم کے لئے راہ ہموار کرنے میں نکلسن کے اس ترجمے نے ایک بڑا اہم رول ادا کیا۔ اس طرح مثنوی اسرار خودی پر رفتہ رفتہ قرار واقعی توجہ کی جانے لگی اور آج اقبال کی اس واحد مثنوی کے حوالے سے جتنا وقیع مواد جمع ہو چکا ہے وہ ماہرین اقبالیات اور ارباب فکر ونظر پر واضح ہے۔ بقول شاعر ؎

میں اکیلا چلا تھا جانب منزل　　لوگ ساتھ آتے گئے کارواں بنتا گیا

انگریزی کے علاوہ کئی دوسری زبانوں میں بھی اسرارِ خودی کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ جیسے اُردو (پروفیسر سید محمد عبدالرشید فاضل اور جسٹس شیخ عبدالرحمان) عربی (ڈاکٹر عبدالوہاب عزام) پشتو (سمندر خان سمندر) بنگالی (سید علی احسن) انڈونیشین (مسٹر بہروم رنگ کوتی) کشمیری (غلام احمد ناز) اور سندھی۔ ان میں سے اکثر تراجم نایاب ہیں۔ جہاں تک پروفیسر سید محمد عبدالرشید فاضل کے منظوم ترجمۂ اسرار خودی ''ترجمان خودی'' کا تعلق ہے، اس کا ایک نسخہ اُردو کے ممتاز نقاد، شاعر اور اقبال شناس پروفیسر آل احمد سرور[1] مرحوم کی ذاتی کوششوں کے باعث اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی کی سمینار لائبریری میں موجود ہے۔ فاضل صاحب کی اقبالیات سے گہری دلچسپی اور شغف کا اندازہ اقبال پر ان کی لکھی ہوئی ان کی کتابوں شرحوں اور تراجم جیسے اقبال اور عشق رسولؐ، بیان بے خودی، شرح بال جبریل، علامہ اقبال (ایک مختصر رسالہ، جس میں اقبال کو ایک مصلح کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے) اور بچوں کے لئے تین حصوں پر مشتمل ان کی ترتیب دی ہوئی کتاب ''سلسلۂ درسیات اقبال'' اور اُن کے ترجمۂ اسرار خودی ''ترجمان خودی'' سے بخوبی ہوتا ہے۔ موخرالذکر کتاب

۱۔ مرحوم کی کوششوں کے طفیل اقبال انسٹی ٹیوٹ میں پاکستان سے شائع ہونے والی اکثر نادر اور نایاب مطبوعات موجود ہیں۔

۱۹۷۳ء میں شائع ہو چکی ہے، اقبال کی سوانح، شاعری اور افکار پر سلیس اور خوبصورت اُردو میں یہ کتاب لکھ کر فاضل صاحب نے بچوں میں اقبال فہمی کا ذوق پیدا کر دیا ہے اور اس طرح ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔ پروفیسر شہرت بخاری کے الفاظ میں ''اس کتاب کے مطالعے سے اقبال کے شاہین بچوں کی عقابی نگاہیں، فکر و نظر کی بلندیوں سے آگاہ ہو سکیں گی اور اپنی تربیت کے لئے بھرپور رہنمائی کر سکیں گی''۔ سلسلۂ درسیات اقبال کی اشاعت سے قبل فاضل صاحب نے اقبال کی فارسی مثنوی اسرار خودی کا منظوم اُردو ترجمہ ''ترجمان خودی'' کے نام سے کیا ہے جو پہلی مرتبہ ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن نظر ثانی کے بعد ۱۹۵۶ء میں منصۂ شہود پر آیا۔ یہ ترجمہ فاضل صاحب کی کسی اضطراری کوشش کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کے پس پشت جو محرکات کارفرما رہے ہیں اُنہیں فاضل صاحب ہی کے الفاظ میں ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

''۱۔ حضرت علامہ کے ساتھ نیاز مندانہ عقیدت اور اُن کے کلام سے والہانہ دلچسپی۔

۲۔ علامہ کے کلام کی اشاعت کو دین کی خدمت سمجھنا۔

۳۔ جو لوگ فارسی زبان سے نا آشنا ہیں اُن کی خدمت میں اس پیغام کو پہنچانے اور اس کی توسیع اشاعت کا جذبہ۔

۴۔ بعض ایسے کرم فرما اور مخلص احباب کی ترغیب و تحریص جن کے ارشاد کی تعمیل سے مفر نہ تھا۔''

اقبال پر کام کرنے والوں میں ایسے بہت ہی کم لوگ ہیں جنہوں نے اُن کے کلام کی اشاعت دین کی خدمت سمجھ کر کی ہے۔ اس اعتبار سے اس کام کے پس پشت کارفرما پروفیسر فاضل صاحب کے جذبے اور خلوص کی جتنی قدر کی جائے، کم ہے۔ جہاں تک اُن کے ترجمۂ اسرار خودی ''ترجمان خودی'' کا تعلق ہے، اس سے اُن کے نہ صرف ایک اچھے شاعر، ایک اچھے ترجمہ کار اور فارسی اور اُردو دونوں زبانوں پر یکساں قدرت رکھنے کا حال معلوم ہوتا ہے بلکہ اُن کے اقبالیات کے ایک مستند عالم ہونے کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اقبال کے پیغام کو جن لوگوں نے اپنے صحیح تناظر میں سمجھا اور سمجھایا ہے، فاضل صاحب کا شمار اُن

لوگوں میں ہونا چاہیے۔ ویسے ترجمہ ایک زبان سے دوسری زبان میں انتقال فکر اور ترسیل کا عمل ہے جو حقیقت میں بڑا ہی دقت طلب ہے اور بظاہر آسان اور اس فن پر مکمل دسترس نہ رکھنے کے نتیجے میں ترجمے کا محض ذہنی مشق ہو کر رہ جانے کا قوی اندیشہ رہتا ہے لیکن ترجمان خودی کا جہاں سے بھی مطالعہ کیا جائے۔ ہر جگہ مترجم کی سلیقہ مندی، حسن بیان اور اظہار مطالب پر اُن کی قدرت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اصل کتاب کی روح کو ترجمہ کار نے ترجمہ میں سمونے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔ اقبال کی اس مثنوی کی تفہیم میں اس پر کام کرنے والوں کو کئی دقتیں پیش آئی ہیں۔ اقبال کے شارح پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے تو اسے سمجھنے کے لئے خود اقبال سے رجوع کیا تھا، اُنہوں نے موصوف سے اسے رہ رہ کر پڑھنے کی تلقین کی تھی۔ ویسے اس مثنوی کو عام طور سے سمجھنے کی ایک وجہ اس کا فارسی زبان میں ہونا تھا اور اقبال کے قارئین اسرار خودی کی اشاعت سے پہلے اُن کے اُردو کلام کا مطالعہ کرنے کے عادی ہو چکے تھے، چنانچہ اقبال کی پہلی ہی فارسی تصنیف کی تفہیم میں اُنہیں دشواری پیش آنے لگی جسے رفع کرنے کے لئے اس کی شرحیں لکھی جانے لگیں اور ترجمے کئے جانے لگے۔ دقت کا معاملہ فقط فارسی زبان کے ذریعۂ اظہار کے ہونے تک محدود نہ تھا بلکہ اقبال کے دقیق افکار اور اُن کے مطالعے کی وسعت، تنوع اور گہرائی بھی اس مثنوی کی تفہیم میں حائل تھی اس لئے یہ مثنوی قارئین سے زیادہ ریاضت اور آگہی کا تقاضہ کر رہی تھی۔ مثنوی کا سرسری طور پر مطالعہ کرنے والوں کی طرف سے اس میں پیش کئے گئے کئی خیالات پر اعتراضات عائد کئے گئے۔ اقبال کے افکار کو اس وقت تک قابل فہم بنانا ممکن نہیں جب تک نہ خود ان پر کام کرنے والا ان کے افکار سے مکمل طور پر آگہی حاصل کر لے اور اُن کے اجتہادی رویے سے ہم آہنگی اور مطابقت پیدا کر لے۔ پروفیسر سید محمد عبدالرشید فاضل نے ترجمے کے آغاز میں ترتیب مضامین کے عنوان کے تحت سبب تالیف کتاب دیباچۂ اشاعتِ ثانی، اقبال کے حالات زندگی، اقبال کی شاعری، اردو شاعری، فارسی شاعری، دربارۂ اسرار خودی، دربارۂ موضوعِ کتاب (اسرار

خودی) مولانا روم کے اشعار اور اُن کا اُردو ترجمہ اور نظیریؔ کا شعر اور اس کا ترجمہ، اسرار خودی کا ترجمہ، جیسے عنوانات قائم کئے ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُنہوں نے اقبال کی اس مثنوی کا اسی اندازِ فکر سے مطالعہ اور ترجمہ کیا ہے جس کا یہ متقاضی تھا۔ فاضل صاحب نے اقبال کے افکار و خیالات کا مطالعہ کرتے ہوئے اُردو دان طبقے کے لئے اس مثنوی کو قابل فہم بنا دیا ہے۔ اقبال نے مثنوی کی ابتداء میں اپنے روحانی پیر و مرشد مولانا رومؔی کی غزل کے جن تین غزلیہ اشعار کو فاتحۃ الکتاب بنایا ہے، اُن کا ترجمہ فاضل صاحب نے کس فن کاری اور چابک دستی کے ساتھ کیا ہے، ملاحظہ کیجئے ؎

کل شہر میں چراغ لئے پھر رہا تھا شیخ　　کہتا تھا ناکسوں میں اک انسان کی ہے تلاش
دل بجھ گیا ہے ست رفیقان راہ سے　　شیر خدا اور رستم دستان کی ہے تلاش
میں نے کہا کہ ڈھونڈھ کے ہم تھک رہے اسے　　کہنے لگا کہ ایسے ہی انسان کی ہے تلاش

اب اسرارِ خودی سے مولانا کے یہ اشعار دیکھئے ؎

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر　　کز دام دو ملولم و انسانم آرزوست
زیں ہمرہان ست عناصر دلم گرفت　　شیر خدا و رستم دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما　　گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

فاضل صاحب نے ان اشعار کے ترجمے کے ذریعے ظاہر کئے گئے رومؔی کے خیال کو اُردو میں خوبی کے ساتھ منتقل کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ اس کوشش میں کامیاب ہو چکے ہیں۔
اس کے بعد اقبال نے اپنے پسندیدہ شاعر نظیریؔ نیشاپوری، جن کا یہ مصرعہ اُنہیں نہایت مرغوب تھا ؎ کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست
اس مصرعے کو اقبال نے اپنے مجموعہ کلام "پیام مشرق" میں اس طرح شعر کی صورت دی ہے۔

بہ ملک جم ندہم از مصرعۂ نظیری را　　کسے کہ کشتہ نشد از قبیلۂ ما نیست

نظیری کا شعر یوں ہے ؎

نیست در خشک و تر بیشۂ من کوتاہی　　چوبِ ہر نخل کہ منبر نشود دار کنم

اس شعر کا ترجمہ سید فاضل صاحب نے اس طرح کیا ہے۔

مرے جنگل کے خشک و تر میں ہر اک چیز ممکن ہے　　بنالیتا ہوں سولی جو شجر منبر نہیں بنتا

اس کے بعد مثنوی کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ اگر ترجمے کے ساتھ مثنوی کا اصل متن بھی دیا جاتا تو اور بھی بہتر ہوتا، اس لئے ترجمے کا مطالعہ کرتے وقت مثنوی اسرار خودی کو سامنے رکھنا لازم ہے۔ مثنوی اسرار خودی اقبال کی وہ تصنیف ہے جس کی تفہیم و تسہیل کا اہم فریضہ انجام دینے والوں میں سید عبدالرشید فاضل کا نام گرامی بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ مثنوی اقبال نے بڑے اجتہاد کے بعد لکھی تھی اور اس کی بدولت اُن کے خلاف ایک معرکہ کھڑا ہو گیا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہی وہ مثنوی ہے جو اُن کی عالمگیر شہرت و مقبولیت کا نقطۂ آغاز ثابت ہوئی۔ فاضل صاحب کے اس ترجمہ کی نسبت اردو شعر و ادب کی جن سرکردہ شخصیتوں نے اپنی گرانقدر آراء کا اظہار کیا ہے، اُن کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق، مولانا ظفر علی خان، مولانا عبدالمجید سالک، حضرت شاداں بلگرامی، مولانا حامد حسن قادری، اور مولانا محمد طاہر فاروقی، ذیل میں اس ترجمے کی نسبت بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی رائے قلمبند کی جاتی ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

"۔۔۔ مجھے اس ترجمے کو دیکھ کر خوشی ہوئی کہ فاضل مترجم کو اس کوشش میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی ہے۔ اُنہوں نے علامہ مرحوم کے مطالب کو صاف ستھری اور بامحاورہ اُردو میں اس طرح ادا کیا ہے کہ اُردو داں اصحاب اس سے بخوبی مستفید ہو سکتے ہیں۔ اردو کا دامن اب اتنا وسیع ہو گیا ہے کہ وہ ہر قسم کے علمی و ادبی خیالات ادا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ مولوی عبدالرشید صاحب نے اسرار خودی کا ترجمہ کر کے اُردو کی قابل قدر خدمت کی ہے"۔[1]

۱۔ سید محمد عبدالرشید فاضل، ترجمان خودی، ص ۴۔

فراقؔ گورکھپوری اقبال کے ایک ہم عصر کی حیثیت سے

رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری ۲۸، اگست ۱۸۹۶ء کو گورکھپور میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد منشی گورکھ پرشاد عبرتؔ کا شمار گورکھپور کے ممتاز وکیلوں میں ہوتا تھا۔ عبرتؔ اُردو کے ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ ''حسنِ فطرت'' اُن کی کامیاب مثنوی ہے۔ موصوف عربی اور فارسی پر بھی اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ فراقؔ ایک معزز کایستھ گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ کایستھ گھرانوں میں بچوں کو اُردو اور فارسی کے ذریعے تعلیم دی جاتی تھی۔ اس لئے خاندانی روایت کے مطابق فراقؔ کی ابتدائی تعلیم و تربیت بھی اُردو اور فارسی سے ہوئی۔ اُنہیں نو سال کی عمر میں ماڈل اسکول گورکھپور میں داخل کیا گیا مگر اگلے برس اُنہیں ایک بہترین درسگاہ مشن اسکول میں منتقل کر دیا گیا، ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد فراقؔ گورنمنٹ جبلی اسکول میں داخل کئے گئے جہاں سے اُنہوں نے ۱۹۱۲ء میں اسکول لیونگ سرٹیفکیٹ دوسرے درجے میں حاصل کیا اور ایف اے کے لئے میسور سنٹرل کالج الہ آباد چلے گئے۔ ۱۹۱۵ء میں ایف اے کا امتحان اول درجے میں پاس کیا اور پھر الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔ اس امتحان میں اُنہوں نے پورے صوبے میں چوتھی پوزیشن حاصل کی۔ اس کے بعد آگرہ یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کا امتحان فرسٹ کلاس میں پاس کیا۔

فراقؔ نے شاعری کی مختلف اصناف جیسے غزل، نظم، رباعی وغیرہ وغیرہ پر طبع آزمائی کی

ہے۔ اُن کے کئی شعری مجموعے ہیں۔ گل نغمہ، روپ، دھرتی کی کروٹ، (گلبانگ، شبنمستان، نغمہ نما اور ان کے دوسرے شعری مجموعوں میں اکثر و بیشتر وہی کلام شائع ہو چکا ہے جو گل نغمہ، روپ اور دھرتی کی کروٹ میں ملتا ہے) گل نغمہ پر اُنہیں گیان پیٹھ ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔ ''روپ'' میں اُن کی رباعیات ہیں اور دھرتی کی کروٹ اُن کی نظموں پر مشتمل مجموعہ ہے۔ نثر میں اُن کے تین مجموعے ہیں۔ اُردو کی عشقیہ شاعری، انداز ے اور اُردو غزل گوئی۔ اُردو غزل گوئی ایک مختصر سی کتاب ہے۔

فراقؔ اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں امیر مینائی کے شاگرد وسیمؔ خیرآبادی سے اصلاح لیتے رہے۔ چنانچہ اُن کی ابتدائی شاعری پر ان دونوں کے کلام کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ دراصل فراقؔ نے اُردو، انگریزی اور ہندی کے ہر بڑے فنکار سے اکتسابِ فیض کیا ہے۔ جیسے میر، غالب، اقبال، ورڈس ورتھ، شیلے، کیٹس، بہاری، کالی داس، تلسی داس، سورداس وغیرہ وغیرہ۔ ان تینوں زبانوں کے بیش قیمت فن پاروں سے فیض حاصل کر کے اُردو شاعری میں اُنہیں جن عناصر کی کمی کا احساس ہوا ہے۔ وہ یہ ہیں جیسے عورت کی دیویت، بچوں کی الوہیت، فطرت سے گہری ہم آہنگی۔ اُنہیں اُردو شاعری میں ہندوستانیت کا فقدان نظر آیا ہے۔ انہوں نے کلاسیکی ہندی شاعری اور سنسکرت کے بعض تراجم کے ذریعے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُن کے نزدیک ''ہندوستانی کلچر یا بلند ہندو کلچر نہ کوئی قومی چیز ہے، نہ ملی چیز ہے، نہ سیاسی چیز ہے اور نہ سطحی چیز ہے۔ وہ ایک آفاقی چیز ہے جس میں کسی مذہبی رسم و رواج کو دخل نہیں ہے''۔[1]

فراقؔ انگریزی کے اُستاد تھے۔ انہوں نے مغربی ادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ وہ بقول پروفیسر آلِ احمد سرور ''مغربی سانچوں سے پوری طرح واقف ہیں مگر ان سے ان کی مشرقیت اور گہری ہوگئی ہے۔ ان کے خیال میں آپ کو بڑی گہرائی ملے گی۔ اتنی گہرائی کہ اُن کی زبان اُکھڑی اُکھڑی اور الجھی الجھی سی معلوم ہوتی ہے''۔[2] فراقؔ فکر سخن کے بعد

۱۔ رسالہ آجکل، دسمبر ۱۹۷۰ء غبارِ کارواں (فراق گورکھپوری)، ص ۹۔
۲۔ فراق۔ شاعر اور شخص (مرتبہ شمیم حنفی)، اُردو غزل کی روایت اور فراقؔ (شمس الرحمٰن فاروقی) ص ۴۴

اظہار کے جس المیے سے دوچار ہوتے تھے اُس کا اعتراف اُنہوں نے خود بھی کیا ہے۔ یوں تو فراقؔ نے کئی اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ اُن کی طبیعت کے جوہر غزل کی صنف میں ہی کھلے ہیں۔ غزل میں اُن کی طول نویسی (اُن کی غزلیں بعض اوقات سو اشعار سے بھی تجاوز کر گئی ہیں) سے انکار کی گنجائش نہیں مگر ان فروعی باتوں کے باوجود اُنہوں نے غزل میں جو توسیعات کی ہیں، وہ اُنہیں اعلیٰ پائے کے غزل گو شعراء کی صف میں لا کھڑا کر دیتی ہیں۔ یہ اشعار ملاحظہ کیجئے۔

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسا بھی نہیں

مدتیں گزریں تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست
آہ! اب مجھ سے تجھے رنجش بے جا بھی نہیں

غرض کہ کاٹ دیئے زندگی کے دن اے دوست
وہ تری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں

شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اُداس اُداس
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں

منزلیں گرد کی مانند اُڑی جاتی ہیں
وہی اندازِ جہاں گزراں ہے کہ جو تھا

بہت پہلے سے ان قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں
تجھے اے زندگی ہم دور سے پہچان لیتے ہیں

کسی کا یوں تو ہوا کون عمر بھر پھر بھی
یہ حسن و عشق تو دھوکا ہے سب مگر پھر بھی

جو چھپ کے تاروں کی آنکھوں سے پاؤں دھرتا ہے
اُسی کے نقشِ کفِ پا سے جل اُٹھے ہیں چراغ

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

حسن کی صباحت کو کیا بتایئے جیسے
چاندنی مناظر پر پچھلی رات ڈھلتی ہے

فراقؔ نے محبوب کے حسن و جمال کی مرقع کشی بڑے خوب صورت اور فنکارانہ انداز میں کی ہے۔ اُن کی جمالیاتی حِس بڑی تیز ہے۔ اُن کے یہاں حسن اپنی ارضیت اور اصلیت کے ساتھ نظر آتا ہے۔ اُن کا ذوق جمال حیات و کائنات کی وسعتوں پر چھا جانے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ وہ بصارت کے ساتھ بصیرت کا سامان بھی فراہم کرتے ہیں۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اُن کے احساس جمال کے متعلق لکھتے ہیں کہ فراق ''حسن و جمال کی بولتی ہوئی روح کے

شاعر ہیں''[1]۔ اُن کے یہاں محبوب کے حسن کی تصویر کشی میں تقدس کا پہلو بھی کارفرما ہے۔ اُن کے اس شعر ؎

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

پر بڑی لے دے ہوئی تھی، مگر ہندوستان میں جنسی اختلاط کا تصور نہ صرف تقدیس اور طہارت کا حامل ہے بلکہ اسے یہاں عبادت و عقیدت کا درجہ بھی حاصل ہے۔ یہ ضرور ہے کہ فراقؔ کے یہاں کہیں کہیں لغزشیں بھی ہوئی ہیں مگر ان کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ اُنہوں نے اُردو غزل کو بہت کچھ دیا۔

فراقؔ کے مجموعۂ رباعیات ''روپ'' میں عورت کا ایک ہمہ گیر تصور ملتا ہے۔ یہ عورت بیٹی ہے، ماں ہے، بیوی ہے، دوشیزہ ہے اور بیسوا بھی ہے۔ عورت کا یہ تصور خالص ہندوستانی ہے۔

ماں اور بہن بھی اور چہیتی بیٹی گھر کی رانی بھی اور جیون ساتھی
پھر بھی وہ کامنی سراسر دیوی اور سیج پہ بیسوا وہ رس کی پتلی

''روپ'' میں بعض رباعیات واتسلیہ رس کی بھی ہیں۔ اس کے تحت ماں کی ممتا اور بچے کی معصوم حرکات بیان کی گئی ہیں۔

کس پیار سے دے رہی ہے میٹھی لوری ہلتی ہے سڈول بانہہ گوری گوری
ماتھے پہ سہاگ آنکھوں میں رس بچے کے ہنڈولے کی چمکتی ڈوری

فراقؔ ہندی کے شاعر سورؔداس سے متاثر ہیں مگر سورؔداس کے یہاں بچے کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور ماں کی حیثیت ضمنی ہے۔ اس کے برعکس فراقؔ کے یہاں مرکزی حیثیت ماں کو حاصل ہے اور بچہ ضمنی حیثیت رکھتا ہے۔

''روپ'' کی رُباعیات کی عورت سہاگن ہے۔ اس میں عورت کا ''ایک گھر دار'' تصور ملتا ہے۔ یہ عورت ایک دیہاتی عورت ہے جس کا مکھڑا چولہے کی سہانی آنچ سے روشن

۱۔ ڈاکٹر فضل حق کامل قریشی (مرتب) فراقؔ گورکھپوری، جوشؔ اور فراقؔ کا جمالیاتی احساس (ڈاکٹر گوپی چند نارنگ)، ص ۸۹۔

ہے، وہ بھوجن پکاتی ہے۔ ہودی پر کھڑی گائے کو چارا کھلا رہی ہے اور اپنے کومل ہاتھوں سے گائے کی گردن تھپکتی ہے۔ یہ وہ ہندوستانی عورت ہے جس کے ہاتھ کے لمس سے زمانے کے دکھ درد کافور ہو جاتے ہیں۔ یہ عورت سنسار کے تپتے ہوئے ویرانے میں سکھ شانت کی ہری کھیتی ہے۔

رباعیات ''روپ'' میں سنسکرت اور ہندی الفاظ اور خوبصورت اور بعض اچھوتی تشبیہوں کا استعمال ملتا ہے۔ مگر سنسکرت کے بعض الفاظ ٹھیٹھ اور بوجھل معلوم ہوتے ہیں مگر پھر بھی ''روپ'' اُردو رباعی میں خاصے کی چیز ہے۔

دھرتی کی کروٹ فراقؔ کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ فراقؔ لکھتے ہیں:

> ''مجھے اپنی غزلوں کی انتہائی حد تک مقبولیت سے صرف ایک شکایت آمیز خوشی ہے کیونکہ میری غزلوں کو سراہتے وقت بہت سے لوگ میری نظموں کو یا میری رباعیوں کو دانستہ یا نادانستہ طور پر نظر انداز کر دیتے ہیں''۔[1]

فراقؔ نے جس شکایت آمیز خوشی کا اظہار کیا ہے اس سلسلے میں ایک اہم بات یہ ہے کہ جب فراقؔ کی نظموں اور غزلوں کا موازنہ کیا جاتا ہے تو اُن کی غزل کا پلّہ بھاری رہتا ہے۔ اس لئے وہ زیادہ تر اپنی غزلوں سے ہی جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ فراقؔ اصل میں غزل مزاج شاعر ہیں۔ غزل کے مزاج سے اُن کی گہری وابستگی کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اُن کی صرف وہی نظمیں کامیاب ہیں جو غزل رنگ ہیں۔ جن میں غزل کی فضا رچی بسی ہے۔

''پرچھائیاں'' کا یہ ابتدائی حصہ ملاحظہ کیجئے۔

یہ شام اک آئینہ نیلگوں، یہ نم، یہ مہک
یہ منظروں کی جھلک، کھیت، باغ، دریا، گاؤں
وہ کچھ سلگنے والے الاؤ
سیاہیوں کا دبے پاؤں آسماں سے نزول

۱۔ گلبانگ، پیش لفظ (فراقؔ گورکھپوری) ص ۵۔

لٹوں کو کھول دے جس طرح شام کی دیوی
پرانے وقت کے برگد کی یہ اُداس جٹائیں
قریب و دور گودھول کی اُبھرتی ہوئی گھٹائیں
یہ کائنات کا ٹھہراؤ، یہ اتھاہ سکوت
یہ نیم تیرہ فضا، روزِ گرم کا تابوت
دھواں دھواں سی زمین ہے گھلا گھلا سا فلک

فراقؔ منظر نگاری اور جزئیات نگاری کرتے وقت فطرت سے اپنی گہری قربت اور اس کے گہرے مطالعے سے اپنی نظموں کو خوبصورت اور دلکش بنا دیتے ہیں۔ وہ اپنی شاعری کو ہندوستانی تہذیب کی رُوح کا ترجمان بنانے کے خواہاں ہیں۔ اُن کی بعض نظموں میں ہندوستانیت اپنی ایک نئی شان کے ساتھ کارفرما ہے۔ اُن کے یہاں ہندوستانی شہروں کی وہ تہذیب نہیں ملتی جو مغربی ممالک کی تہذیب سے متاثر ہے بلکہ یہ خالص ہندوستانیت ہے۔ جیسے بھری بھری برسات، ملگجی گھٹائیں، سرِ صحن رقصِ پیپل، تمولیوں کی دکانیں، سلگتے الاؤ، کھنکتے ستار، سفید کنول، ندی کا سہاگ، گنگا کی روانی، گھنگھروں کی جھنکار، اوس میں چپ چاپ ہار سنگار کا پیڑ، حیا کی سگندھ سے بوجھل دلہن، دیوالی کے دیپ، ہنڈولہ، جگنو، سرسوتی کے ستار کی گت، برگد کی اُداس جٹائیں، کام روپ کا جادو وغیرہ وغیرہ، ''دیوالی کے دیپ جلے'' فراقؔ کی ایک اور نظم ہے۔ دیوالی خوشیوں اور مسرتوں کا ایک تہوار ہے مگر زمانے کے ظلم و ستم کے سامنے یہ خوشیوں اور مسرتوں بھرا تہوار بھی لاکھوں آنسوؤں میں ڈوبا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ہر سو بدحالی کا دور دورہ ہے۔ فراقؔ نے اس نظم میں طنزیہ لہجہ اختیار کیا ہے۔

آج رات کو بدحالی نے خوشحالی کا سوانگ بھرا بنی لکشمی دکھ کی رانی دیوالی کے دیپ چلے

نظم ''دھرتی کی کروٹ'' میں فراقؔ نے اپنے عہد اور وطن کی صورتِ حال پیش کی ہے۔ اس میں بیدار محنت کش طبقہ اپنے احساسات اور عزائم کا اظہار کرتا ہے۔ اس میں مزدوروں اور محنت کشوں کو استحصال پسندوں کے خلاف نبرد آما ہونے کی تلقین کی گئی ہے۔ یہ خاصی طویل

نظم ہے۔اس کے کئی بند سپاٹ ہیں۔ ''ہنڈولہ'' میں آپ بیتی کا سلسلہ جگ بیتی سے جا ملتا ہے۔اس میں شاعر نے ہندوستان کے ماضی، حال اور مستقبل کے درمیان اپنی کہانی پیش کی ہے۔ ''داستانِ آدم'' میں فراقؔ کی انسان دوستی اور انسان پر اُن کے مکمل اعتماد کا جو اظہار ہوا ہے۔اس میں رنگ، نسل، مذہب اور علاقہ سے بالاتر ہو کر انصاف اور آزادی کی خاطر انسان کی جدوجہد، جابر قوتوں کے خلاف معرکہ آرائی، تہذیب و تمدن کے ارتقاء میں انسان کا رول، اپنی صلاحیت اور قوت پر انسان کا اعتماد، روشنی کی جانب اُس کی مسافت کو جاری رکھنے، ان تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ خصوصاً ''ٹیپ کا مصرعہ ہے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں، ہم زندہ رہیں گے، انسان کے حوصلوں کو بلند کرتا اور اس کے ارادوں کو پختہ اور متحرک کر کے ہر زمانے میں اُسے اپنی بقا کا احساس دلاتا ہے۔ ''عشق اور موت'' ایک مختصر نظم ہے اس میں غم کا موضوع کارفرما ہے۔ فراقؔ نے غالبؔ کی طرح ردیف ہائے ہائے میں اپنے بھائی کے انتقال پر ایک پُر درد مرثیہ کہا ہے

اُف بگولوں کا یہ عالم بادِ صرصر کا یہ جوش — خاک اُڑاتا ہے ترے غم میں بیاباں ہائے ہائے
مرنے والے یاد آتی ہے جواں مرگی تیری — اُٹھ گیا دل میں لئے تو دل کے ارماں ہائے ہائے

فراقؔ کی نظموں کا بھی اپنا ایک الگ مقام ہے۔ ہم ان کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتے۔ مگر نظم گو کی حیثیت سے اُن کا مقام اس قدر بلند نہیں جس قدر غزل گو کی حیثیت سے اُن کا مقام اعلیٰ ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور نے صحیح کہا ہے ''فراقؔ ہمارے بڑے غزل گو شعراء میں سے ہیں۔ اُنہوں نے اگرچہ نظمیں بھی کہی ہیں مگر نظم میں اُن کا کوئی خاص کارنامہ نہیں''۔[1]

فراقؔ نے دوہے اور تضمینیں بھی کہی ہیں۔ اُردو تنقید میں بھی اُن کا ایک اہم مقام ہے۔ اندازے، اُردو کی عشقیہ شاعری اور اُردو غزل گوئی کی تحریروں کے تناظر میں دیکھا جائے تو وہ ایک تاثراتی نقاد کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ بقول پروفیسر آل احمد سرورؔ ''اُن کی تاثراتی تنقید اپنے اندر ایک بانکپن رکھتی ہے''۔[2]

۱۔ فراقؔ: شاعر اور شخص، (مرتب شمیم حنفی) پروفیسر آل احمد سرور، فراقؔ۔ چند یادیں، ص ۲۳۵۔
۲۔ ایضاً، ص ۲۳۶۔

''اندازے'' میں مصحفی، ذوق، حالی، رابندر ناتھ ٹیگور اور عبدالحلیم شرر پر بھی مضامین درج ہیں۔ بقول سرور صاحب ''مصحفی کی اہمیت کی طرف اگرچہ حسرت نے سب سے پہلے توجہ دلائی تھی مگر فراق اور مصحفی پر مضمون مصحفی کو اس کا حق دلانے میں سب سے زیادہ معاون ہوا''۔[1]

فراق علامہ اقبال کے جونئر ہم عصر تھے۔ فراق کے کلام کا بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اقبال سے متاثر بھی تھے۔ اُنہوں نے اُن کے کلام کا مطالعہ بھی کیا تھا۔ اُنہوں نے اُن کی از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز والی نظم سے متاثر ہو کر ایک نظم ''ترانۂ خزاں'' لکھی ہے۔ (اس نظم میں شیلے کی Ode to the West Wind کی تحریک بھی کارفرما ہے)۔ فراق کی بعض نظموں کے عنوانات بھی اقبال کی نظموں کے عنوانات سے مماثل ہیں۔ جیسے جگنو، تنہائی وغیرہ وغیرہ، اُن کا مقالہ ''اُردو کی عشقیہ شاعری'' پہلے بجنور کے ایک قومی اخبار ''مدینہ'' کے جوبلی نمبر باپت اپریل ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اسے خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ پھر اسے الگ سے کئی اضافوں کے ساتھ شائع کیا گیا۔ جس میں کئی نئی باتوں اور نئے مسائل پر روشنی ڈالی گئی اور ۱۹۳۹ء کے بعد کی عشقیہ شاعری کا بھی جائزہ لیا گیا۔ اس کتاب کو سنگم پبلشنگ ہاؤس الہ آباد نے جنوری ۱۹۴۵ء میں شائع کیا۔ اس میں جگہ جگہ اقبال کے اشعار کا حوالہ دیا گیا ہے اور اُن کی تعریف کی گئی مثلاً

رہیں عشق میں نہ وہ گرمیاں حسن میں نہ وہ شوخیاں — نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں
لازم ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل — لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

''بانگِ درا'' کی نظموں محبت ؎ عروسِ خم کی زلفیں تھیں ابھی نا آشنا خم سے

اور ؎ خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا، کے متعلق لکھا ہے کہ ان میں ''حسن اور عشق کی ماہیتوں اور ان کی پراسرار حقیقتوں پر اعلیٰ آفاقی تصور و تخیل کی پہلی فن کارانہ مثالیں ہیں۔ اقبال کے پورے کلام میں حسنِ پیکرِ انسانی سے گزر کر اور عشق کی ماہیتیں جنسیات سے آگے

۱۔ فراق: شاعر اور شخص، (مرتب شمیم حنفی) پروفیسر آل احمد سرور، فراق۔ چند یادیں، ص ۲۳۶۔

بڑھ کر وہ پُر رمز حقیقتیں اور قوتیں ہوگئی ہیں جن کے ہاتھوں کائنات کی تخلیق ہو رہی ہے، جو کائنات کو سنبھالے ہوئے ہیں اور جو حیات و کائنات کو منزل بہ منزل آگے بڑھا رہی ہیں۔ ارتقاء کے راز حسن و عشق کے اس تصور میں پنہاں ہیں۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں　　ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں"[1]

آگے چل کر اقبال کے اس شعر

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے　　بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

کے متعلق لکھتے ہیں: "اسے آپ محض نرگس، بے نوری اور چمن کے الفاظ آجانے سے کیا فرسودہ بتائیں گے۔ دیکھئے کتنا خلاقانہ استعمال ان الفاظ کا ہوا ہے۔[2]

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں، کو لاجواب بتایا ہے۔

مگر ۱۹۷۷ء کے "آجکل" کے اقبال نمبر میں اُنہوں نے جو مضمون "اقبال کے متعلق خوش فہمیاں" کے عنوان سے لکھا ہے (اور جو تناظر ۱۹۸۰ء میں ایک دوسرے عنوان سے شائع ہو چکا ہے) اُس میں دو ایک جگہ اقبال کے کلام کی تعریف کی گئی ہے، جیسے اُنہوں نے اُن کی شاعری کے اُس حصہ کو پسند کیا ہے جسے اُنہوں نے Poetry of Aphorism or Snings کا نام دیا ہے، مگر بحیثیت مجموعی اس کی نوعیت مخالفانہ معلوم ہوتی ہے۔ اس مضمون کا مطالعہ کرنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فراقؔ نے اقبال کی شاعری کو پرکھنے کے لئے پہلے سے ایک ایسا معیار قائم کیا ہے جس میں وہی عناصر کارفرما ہیں، جن کا فقدان اُنہوں نے اُردو شاعری میں محسوس کیا ہے اور جنہیں اُنہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے سے پورا کرنے کی کوشش بھی کی ہے اور بلند بانگ دعوے بھی کئے ہیں۔ جیسے قوتِ شفا، آفاقی کلچر، وسیع معنوں میں انسان دوستی وغیرہ وغیرہ۔ کلامِ اقبال سے اُنہوں نے کیا کیا توقعات وابستہ کی تھیں۔ ملاحظہ کیجئے:

۱۔ فراقؔ گورکھپوری، اُردو کی عشقیہ شاعری، ص ۶۰۔

۲۔ تناظر ۱۹۸۰ء، اقبال کے داخلی محرکات (فراقؔ گورکھپوری)، ص ۹۔

"میں ساٹھ برس سے مسلسل یہ محسوس کرتا ہوں کہ دنیا کی قدیم سے قدیم شاعری سے لیکر آج تک کی شاعری، جو کئی زبانوں پر مشتمل ہے، اس کا اونچا سے اونچا لہجہ اور اس کی انتہائی بلندی سب کچھ اقبال کے اُردو و فارسی کلام میں مل جاتی ہے اور دنیا کے بڑے بڑے شاعروں کے یہاں جو خوبیاں ہیں، وہ اقبال کے یہاں بھی موجود ہیں"۔[1]

اور جب وہ کلام اقبال کو ان تمام عناصر سے خالی پاتے ہیں تو انتہا پسند ہو کر اسے اپنی "خوش فہمی" کا نام دیتے ہیں، مگر تنقید کا یہ رویہ صحیح نہیں ہے۔ وہ منطقی استدلال اور حقیقی بنیادوں پر مبنی ہوتی ہے۔ شاعری میں صرف عورت کی دیوئیت، قوت شفا، بچوں کی الوہیت، وسیع معنوں میں انسان دوستی ہی وہ معیار نہیں ہے کہ جو شاعر اس معیار پر پورا نہ اُترے۔ ہم اُس کی ٹوٹل دین سے منکر ہو جائیں۔ پھر یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ جو خصوصیات فراق کی شاعری میں موجود ہیں وہ اقبال کے کلام میں بھی موجود ہوں۔ اقبال کی اپنی ایک منفرد شخصیت ہے۔ اُن کا اپنا ایک مخصوص مقام ہے اور ایک اعلیٰ مقام ہے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ اقبال نے جو پیغام دیا ہے۔ اُنہیں اُس میں کس حد تک کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اُن کی فکر میں کس قدر گہرائی ہے۔ فراق نے اقبال پر بہت سے اعتراضات عائد کئے ہیں۔ مثال کے طور پر اقبال کی ایک "Split Personality" ہے کیونکہ اُنہوں نے پہلے ہندوستان کو سارے جہاں سے اچھا قرار دیا مگر بعد میں وہ اس خیال سے "خوفزدہ" ہو کر کہنے لگے ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستان ہمارا

فراق نے اسے اقبال کے متضاد ذہن کی پیداوار قرار دیا ہے۔ بغور دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ فراق نے اقبال کی شاعری کے فکری ارتقاء کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ ہر بڑے فنکار کا فن مختلف مراحل سے ہو کر گزرتا ہے اور جیسے جیسے وہ یہ مراحل طے کرتا جاتا ہے اُس کی فکر میں گہرائی، نظر میں وسعت اور تخیل میں بلندی پیدا ہو جاتی ہے۔ اُس کا ویژن broad

---

۱۔ تناظر ۱۹۸۰ء اقبال کے داخلی محرکات (فراق گورکھپوری)، ص ۹

ہوجاتا ہے۔تو اگر اقبال نے پہلے ہندوستان کو سارے جہاں سے اچھا قرار دیا اور بعد میں چین وعرب ہمارا سارا جہاں ہمارا کہہ کر اس دائرے کو اور بھی وسیع کیا تو اس میں تضاد یا split personality والے اعتراض کا کوئی عمل دخل نہیں ہونا چاہیے۔مجنون گورکھپوری نے اقبال پر جو کتابچہ لکھا ہے۔اس میں اُنہوں نے بھی اقبال کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔اُنہوں نے فراق کے الفاظ میں ''اقبال کے فکری کھوکھلے پن اور گمراہ کن تصورات اور رجحانات کا ذکر کردیا ہے اور مجنون نے اقبال کی عقابیت کا پردہ فاش کیا ہے''۔فراق نے مجنون گورکھپوری کے اسی مقالے کو دُوررس اور جامع کہا ہے اور اُنہوں نے اُن کی ہمنوائی کر کے اقبال کو اعتراضات کا ہدف بنایا۔اُنہوں نے اقبال کے فلسفۂ خودی کو کس طرح سراہا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

''اقبال کا من گھڑت فلسفۂ خودی یا بے خودی جرمن مفکر نطشے سے مستعار ہے۔نطشے کے جرمن قوم کی دنیا کی تمام دوسری باتوں سے برتری اپنے فلسفۂ فوق البشر میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔اقبال نے ملت اسلام یا اسلامی آبادی کے سر پر کاغذی تاج رکھ دیا ہے۔ایک طرف مشہور فلسفی برگساں سے مستعار خیالات کو جزو اسلام بنایا ہے۔دوسری طرف برگساں کو گمراہ بھی بتایا ہے۔رامانج کے فلسفہ کو سراہا ہے اور یہ بھی لکھ دیا ہے یہی اسلام ہے''۔[1]

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اقبال ایک بہت بڑے شاعر اور فلسفی تھے اور فراق کی یہ بُری عادت تھی کہ کوئی اُن سے سبقت لے جائے تو یہ اُن کی برداشت سے باہر تھا۔ایک مرتبہ علی سردار جعفری اور فراق دونوں ایک مشاعرے میں شرکت کرنے کے لئے جارہے تھے۔راستے میں سردار جعفری سے لڑ پڑے اور کہنے لگے کہ یا تو آپ مشاعرے میں شرکت کریں گے یا میں کروں گا۔دونوں نہیں کرسکتے۔فراق نے اپنے آپ کو شاعر اعظم کہلوانے

۱۔ تناظر ۱۹۸۰ء اقبال کے داخلی محرکات (فراق گورکھپوری) ص ۱۱۔

کی خاطر کیا کیا بلند بانگ دعوے کئے ہیں۔ یعنی اُن کی شاعری میں آفاقی کلچر ہے، امرت بانی ہے، قوتِ شفا ہے، وہ معصوم آنسو ہیں جو ہمیں کالیداس، تلسی داس، سورداس اور دوسرے سنتوں اور فقیروں کے کلام میں ملتے ہیں اور اقبال کا کلام ان تمام خصوصیات سے عاری ہے۔ اُن کے نزدیک یہی خصوصیات شاعر کو آفاقی کلچر کا ترجمان بنا دیتی ہیں۔ فراقؔ نے اقبالؔ کی روحانیت کو ایک ''فکری ورزش'' کہا ہے۔ اُن کے نزدیک اقبال کے یہاں دوڑ دھوپ اور حرکت کے نعرے ہیں۔ اور ان کی ملت زدگی یا جنونِ ملت یا ملت اور اس کے ساتھ ساتھ انسان دوستی کا دعویٰ دو دل پن کا شکار ہو کر رہ گیا ہے''۔[1]

اقبال کے تئیں اس بے انصافی کا سبب بیان کرتے ہوئے پروفیسر آل احمد سرور نے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ ''وہ فکر اقبال سے اپنے آپ کو ہم آہنگ نہ کر سکے''۔[2]

مگر یہ تعجب کی بات ہے کہ یہ مضمون فراقؔ نے اس زمانے میں لکھا ہے جب اُنہیں اپنا تخلیقی سفر شروع کئے ہوئے ایک طویل عرصہ گزرا تھا اور وہ اُردو کی عشقیہ شاعری، انداز اور اُردو غزل گوئی کے بھی مصنف ہو چکے تھے۔ بہت پہلے پروفیسر آل احمد سرور نے اُن کے متعلق کہا تھا کہ ابھی ان میں فکر کی پختگی نہیں آئی اور شمس الرحمٰن فاروقی اس کے بعد بھی اُن کی فکری پختگی کے منتظر تھے، اور میرے خیال میں ۱۹۷۷ء میں بھی جب فراقؔ نے یہ مضمون اقبال کے متعلق سپرد قلم کیا، اُس وقت بھی اُن کی فکر پختگی سے عاری نظر آتی ہے۔

۱۔ تناظر ۱۹۸۰ء، اقبال کے داخلی محرکات، (فراق گورکھپوری) ص ۱۲۔

۲۔ ایضاً

زیرپای اُمہات آمد جناں

اقبال موجودہ صدی کے ایک ممتاز شاعر، عالمِ دین، دانشور اور فلسفی تھے۔ وہ چشم بینا رکھتے تھے۔ انہوں نے زندگی اور معاشرے کے کم و بیش ہر پہلو کے بارے میں اپنے تاثرات و خیالات کا اظہار کیا ہے۔ بنیادی طور پر وہ انسانی مسائل میں گہری دل چسپی رکھتے تھے وہ انسان کو انسانی اوصاف سے متصف دیکھنا چاہتے تھے تاکہ وہ سربلندی اور سرخروئی سے جی سکے، وہ گھر اور معاشرے کے اہم رکن یعنی عورت کے بارے میں بھی ایک دردمندانہ رویہ رکھتے تھے اور عورت کو عزت و آبرو کا مقام دلوانا چاہتے تھے۔ اقبال کے کلام میں عورت کے مقام و منصب کا جائزہ لینے کے لئے ان کی مختلف تحریروں کو گہرائی اور دقت نظر کے ساتھ جانچنے کی ضرورت ہے۔ اقبال ۱۹۲۸ء کے اواخر میں مسلمانانِ مدراس کی دعوت پر جنوبی ہند کے دورے پر گئے۔ اپنے اس دورے کے دوران انہوں نے کئی لیکچر دئے جو بعد میں اُن کے مجموعۂ خطبات ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' کے نام سے شائع ہوئے۔ مدراس میں قیام کے دوران اُن کی کئی مصروفیات رہیں۔ ۷ جنوری ۱۹۲۹ء کو کاکرس گارڈن مدراس میں انجمن خواتین اسلام مدراس کی جانب سے منعقد کی گئی ایک تقریب میں علامہ نے شرکت کی اور مدراس کی مسلم خواتین کے سپاسنامے کے جواب میں ایک بصیرت افروز لیکچر ''اسلام میں عورت کا مقام'' کے عنوان سے دیا۔ اس لیکچر میں انہوں نے اسلام میں عورت اور مرد کے حقوق اور اسلامی شریعت میں عورت کے مقام و منصب پر روشنی ڈالی۔ مذکورہ لیکچر کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ علامہ نے عورت کو قرآنی ارشادات کے تناظر میں دیکھا ہے اور اُسے اسی تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت دونوں کی نسبت فرمایا ہے۔ ''ھن لباس لکم و انتم لباس ھن''۔ اسلام کے نقطہ نظر سے قرآن حکیم نے عورت کو مرد کا اور مرد کو عورت کا لباس قرار دیکر دونوں کو ایک دوسرے کی خاطر ناگزیر قرار دیا ہے۔ بقول اقبال ؎

پوشش عریانیٔ مرداں زن است حسن دلجوئے عشق را پیرہن است

مرد کا وجود عورت کے بغیر اور عورت کا وجود مرد کے بغیر نامکمل ہے۔ ''جاوید نامہ'' میں مرد اور عورت کو ایک دوسرے کا رفیق و شریک کہا گیا ہے۔ اس طرح دونوں کو کئی اعتبار سے مساوی درجہ تفویض کیا گیا ہے۔ شریعت محمدیؐ کی رُو سے پہلی مرتبہ عورت کے حقوق سماج اور خاندان پر نہایت اعتدال اور انصاف کے ساتھ متعین کئے گئے۔ عورت کے وجود کو باقاعدہ طور پر تسلیم کیا گیا اور ایک مثالی معاشرے کی تشکیل کے لئے عورت اور مرد دونوں کو جدا جدا فرائض تفویض کئے گئے۔ ایسا کرتے ہوئے مرد اور عورت کے جسمانی، ذہنی اور نفسیاتی کوائف اور خصائص کو مدنظر رکھا گیا چنانچہ ان کی جسمانی ساخت، فطرت اور صلاحیت کے اعتبار سے ان کے درمیان تقسیم کار کو روا رکھا گیا اور ان کے دائرہ ہائے عمل کو متعین کیا گیا، چنانچہ عورت کو نسلِ انسانی کی بقاء کا کام سونپا گیا جو اس کی فطرت اور جسمانی ساخت سے مطابقت رکھتا ہے اور مرد کو بھی اسی طرح اپنی جسمانی ساخت، فطرت اور صلاحیت کے اعتبار سے کام تفویض کیا گیا ہے، مرد اور عورت دونوں پر فرائض عائد کئے جانے کے پہلو بہ پہلو اُن کے حقوق کا تحفظ بھی کیا گیا۔

اقبال کو شکوہ ہے کہ عورت کو قرآنی آیات کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ انتہا تو یہ ہے کہ علماء نے قرآن پاک کی آیات کو اپنے صحیح تناظر میں نہ سمجھ کر ان آیات کی صحیح تعبیریں پیش نہیں کی ہیں۔ نتیجے کے طور پر مرد کے تفوق اور برتری کے تصور کو عام کر کے عورت کو کمتر اور ضعیف قرار دیا گیا۔ اس طرح ذہنوں میں عورت کے بارے میں منفی اور مضرت رساں تصورات پیدا کئے گئے۔ مثال کے طور پر ''الرجال قوامون علی الالنساء'' سے یہ مراد لیا گیا کہ مرد کو عورت پر تفوق حاصل ہے جب کہ اقبال کی نظر میں

"عربی محاورے کی رُو سے یہ تفسیر صحیح معلوم نہیں ہوتی۔ عربی گرامر کی رُو سے قائم کا صلہ جب علیٰ پر آئے تو معنی مخافطت کے ہو جاتے ہیں"۔ اقبال کو تاریخی نقطہ نظر سے طبقہ نسواں کی بیچارگی اور مظلومیت کا احساس تھا۔ وہ مظلومی نسواں سے بے حد غمناک ہیں۔ انہیں شکایت ہے کہ دورِ انحطاط میں مرد کی طرف سے عورت کے تئیں بڑی بے اعتنائی اور غفلت برتی گئی مگر عورت مرد کی اس بے اعتنائی اور تغافل کے باوجود اپنے فرائض کو خوش اسلوبی سے پورا کرتی رہی۔ اقبال کے نزدیک مسلمان مردوں نے شریعت کی دی ہوئی آزادی سے بے جا فائدہ اٹھا کر عورت کا استحصال کیا۔

اقبال نے خواتین کے حقوق کی وکالت کرتے ہوئے ان کی کوتاہیوں کی نشاندہی کی ہے، تاہم وہ مجموعی طور پر ان کی بیچارگی پر کڑھتے رہے اور ان کی حق تلفیوں کا ازالہ کرنے کے لئے جدوجہد کرتے رہے۔ اس سلسلے میں اُن کا کہنا ہے کہ انہوں نے عدالتوں میں جا کر لڑکیوں کو اپنے جائز حقوق دلوانے کی خاطر آواز اُٹھائی ہے اور بعض اوقات تو یہ کام انہیں بلا معاوضہ کرنا پڑا ہے۔ اقبال کے نزدیک جو حقوق شریعتِ اسلام نے خواتین کو دئے ہیں انہیں وہ بہر حال ملنے چاہیں۔ انہوں نے مسلمان مرد اور عورت کو قرآن کا غائر مطالعہ کرنے، اس کی تعلیمات کو سمجھنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کی تاکید کی ہے جہاں تک مرد و زن کی مساوات کا تعلق ہے، اقبال اس تصور کے حامی ضرور ہیں، مگر انہوں نے اس تصور کی اُن معنوں میں ہرگز حمایت نہیں کی ہے جو اس سے یورپ میں مراد لئے جاتے ہیں۔ یورپ کی خواتین آزاد ضرور ہیں مگر یہ آزادی اُن کی تباہی پر منتج ہوتی ہے۔ یہ اُن کی شخصیت کو کھوکھلا کرتی ہے۔ یہاں تک کہ انسانیت کی بقا تک خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ یورپی تہذیب صنعتی ترقی کے اعتبار سے بہت آگے ہے لیکن اس نے معاشرے میں طرح طرح کی الجھنوں کو جنم دیا ہے۔ زن و مرد کے تصور مساوات سے پیدا شدہ پیچیدگیوں کا ذکر کرتے ہوئے اقبال لکھتے ہیں:

> "میں عورت اور مرد کی مساوات کا مطلق حامی نہیں ہوں۔ قدرت نے ان دونوں کو جدا جدا خدمتیں تفویض کی ہیں اور ان فرائض جداگانہ کی صحیح اور

باقاعدہ انجام دہی خانوادۂ انسانی کی صحت اور فلاح کے لئے لازمی ہے، مغربی دنیا میں جہاں نفسا نفسی کا ہنگامہ گرم ہے اور غیر معتدل مسابقت نے ایک خاص قسم کی اقتصادی حالت پیدا کردی ہے، عورتوں کا آزاد کردیا جانا ایک ایسا تجربہ ہے جو میری دانست میں بجائے کامیاب ہونے کے الٹا نقصان رساں ثابت ہوگا اور نظامِ معاشرت میں اس سے بے حد پیچیدگیاں پیدا ہوجائیں گی۔ خاندانی وحدت کے رشتے کو جو بنی نوع انسان کی رُوحانی زندگی کا جزو اعظم ہے یہ حریت توڑ دیتی ہے"۔

مغربی ممالک میں خواتین کی نام نہاد آزادی اور اس کے بھیانک نتائج کے بارے میں اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں:

واں تہی آغوش نازک پیکری — خانہ پرورد نگاہش محشری
فکر او از تاب مغرب روشن است — ظاہرش زن باطن او نازن است
بند ہای ماتِ بیفا گسیخت — تاز چشمش عشوہ ہا حل کردہ ریخت
شوخ چشم و فتنہ زا آزادیش — از حیا ناآشنا آزادیش
علم او بارِ امومت برنتافت — برسر شامش یکے اختر نتافت
ایں گل از بستان ما نارستہ بہہ — داغش از دامان ملت شستہ بہہ

وقت نے ثابت کیا کہ اقبال کے تاثرات ومشاہدات حقیقت پر مبنی تھے، وہ چاہتے تھے کہ یورپ میں جس طرح عورت کو کھلی چھوٹ دینے پر سارا معاشرہ بکھر رہا ہے، اس سے اسلامی معاشرہ محفوظ رہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اقبال اس بات پر زور دیتے رہے کہ قرآن کو عالمگیر سطح پر اپنا ہادی بنایا جائے اور اسلام کے اصولوں کی پیروی کی جائے تاکہ اس مسئلے کا بآسانی حل تلاش کیا جاسکے۔ اقبال نے عورت کی شخصیت پر فطرت کے تقاضوں کی روشنی میں غور وفکر کیا ہے۔ وہ جس طرح قوم کے نوجوانوں کے تساہل اور بے عملی سے پریشان تھے اور انہیں قدرت کی طرف سے ودیعت کی گئی بے پناہ اور غیر معمولی صلاحیتوں کو

بروئے کار لانے کی تلقین کرتے تھے اُسی طرح خواتین کی بے راہ روی، فرض ناشناسی اور اپنی فطرت کے تقاضوں کو پس پشت ڈالنے پر متردد تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ اپنے اندر اصل مقام کو پھر سے حاصل کرنے کا احساس جگائیں۔ ''ارمغان حجاز'' میں ''دختران ملت'' کے عنوان سے باب میں کہتے ہیں ؎

بہل اے دخترک ایں دلبری ہا　　مسلمان را نہ زیبد کافری ہا
منہ دل بر جمال غازہ پرورد　　بیاموز از نگہ غارت گری ہا
نگاہ تست شمشیر خداداد　　بزخمش جان ما را حق بماداد
دل کامل عیار آن پاک جان برد　　کہ تیغِ خویش را آب از حیا داد
اگر پندی ز درویشی پزیری　　ہزار اُمت بمیرد تو نہ میری
بتولی باش و پنہاں شو ازین عصر　　کہ در آغوش شبیری بگیری

اقبال کے یہاں عورت منصب امومت کے باعث بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ نسل انسانی کی بقا اُس کا اصل کام ہے۔ فرضِ امومت اور نسل انسانی کی بقا کے سلسلے میں یہاں ''جاوید نامہ'' کی اس نبیہ مُریخی جو آسمان سے نازل ہوتی ہے اور جسے نبیۂ آخر الزماں ہونے کا دعویٰ ہے، کا ذکر کرنا غالباً بے محل نہ ہوگا۔ اس کے پردے میں انہوں نے یورپی خواتین کی بے راہ روی کی کڑی نکتہ چینی کی ہے۔ فلک مریخ پر مذکورہ نبیہ جو اصل میں جدید مغربی تہذیب میں آزادیٔ نسواں کی تحریک کی علمبردار یا رہنما ہے، ایک وسیع میدان میں مرد و زن کے ایک بڑے اجتماع سے خطاب کرتی ہے اور خواتین کو بارِ امومت کی صعوبتوں سے آگاہ کرتی ہے۔ نبیہ مُریخی مرد و زن کے تعلقات کو خالص مادی نقطہ نظر سے دیکھ کر انہیں سماجی اور خاندانی بندھنوں کے تقدس سے آزاد کرانا چاہتی ہے تاکہ دونوں پر کسی قسم کی ذمہ داری یا پابندی عاید نہ ہو، دونوں بغیر کسی رکاوٹ کے اپنی خواہشات کی تکمیل کرسکیں۔ نبیہ مرد و زن کے تعلقات کو اخلاقی ضابطوں سے بھی آزاد کرانا چاہتی ہے۔ وہ ہرگز نہیں چاہتی کہ عورت بیوی اور ماں بنے اور نہ ہی مرد کے شوہر اور باپ بننے کی وہ روادار ہے ؎

دلبری اندر جہاں مظلومی است دلبری محکومی و محرومی است
از امومت زرد روئے مادراں اے خنک آزادیٔ بے شوہراں

نبیہ کا کردار عورت کے اصل مقام و منصب یعنی نسل انسانی کی بقا کے عمل اور فرض امومت کو وبال جان سمجھتا ہے، اسی لئے اقبال تہذیب فرنگی کی بے پناہ ترقی کے باوجود اسے مرگ امومت قرار دیکر بنی نوع انسان کے لئے اس کے ثمر کو موت سے تعبیر کرتے ہیں ؎

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت
بیگانہ رہے دین سے اگر مدرسۂ زن ہے عشق و محبت کے لئے علم و ہنر موت

اقبال نے اپنی وسیع النظری اور حقیقت پسندی کی بناء پر مغربی تہذیب کی چند خوبیوں (علم و فن) کی سراہنا ضرور کی ہے لیکن اس تہذیب کے مضرت رساں اثرات پر بھی اُن کی حکیمانہ نظر برابر رہی ہے اور وہ مشرقی اقوام کو ان کے زہریلے اثرات سے محفوظ رہنے اور اپنی شاندار مشرقی روایات کی پاسداری کرنے اور ان کا احیاء کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ مغربی تہذیب لادینی تہذیب ہے اور اس تہذیب کی بنیاد مادہ پرستی پر ہے اور یہ تہذیب ان کے نزدیک ''اپنے ہی خنجر سے آپ، خودکشی'' کا ارتکاب کرے گی۔ جہاں تک نبیۂ مریخی کا تعلق ہے وہ آزادیٔ نسواں کی اس حد تک علمبردار اور طرفدار ہے کہ انسانیت کی بقا تک کو زبردست خطرہ لاحق ہے، اسی لئے اقبال کے مرشد روحانی مولانا رومی ارشاد فرماتے ہیں کہ دین صحیح معنوں میں جب ہی پروان چڑھ سکتا ہے جب انسانی تہذیب اس سے عشق کرلے اور دین رب کائنات سے محبت اور اس کے احکامات کی پابندی اور بجا آوری کا نام ہے۔

اقبال نے اُردو کے علاوہ فارسی کلام میں بھی عورت پر اظہارِ خیال کیا ہے، ضرب کلیم، ارمغانِ حجاز، اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی اور جاوید نامہ (سخنے بہ نژادِ نو) میں عورت سے متعلق مختلف تصورات ملتے ہیں۔ ضربِ کلیم میں عورت کے عنوان سے ایک پورا باب ملتا ہے جو نو نظموں پر مشتمل ہے۔ ارمغانِ حجاز میں ''دخترانِ ملت'' کے زیرِ عنوان آٹھ رُباعیات ملتی ہیں۔ رموزِ بے خودی میں دو عنوانات اس مقصد کے لئے وقف کئے گئے ہیں۔ پہلا

"درمعنی اینکہ بقای نوع از امومت است وحفظ واحترام امومت اسلام است" اور دوسرا درمعنی ایں کہ سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراؓ اسوۂ کاملہ است برای نساء اسلام"۔ جہاں تک ضربِ کلیم کا تعلق ہے، یہ بات ذہن میں رہے کہ اس تصنیف کے آغاز ہی میں مصنف نے اپنے مقصد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ "عصرِ حاضر کے خلاف اعلانِ جنگ" ہے۔ اقبال کو عصرِ حاضر میں جو خامیاں اور خرابیاں نظر آئیں انہوں نے ان پر اپنے ردعمل کا اظہار کر کے اُن کے خلاف اعلانِ جنگ کیا ہے۔ مذکورہ تصنیف میں ایک مکمل باب عورت کے لئے وقف کیا گیا ہے اور یہ باب جن نو نظموں پر مشتمل ہے اُن کے عنوانات اس طرح سے ہیں۔ مردِ فرنگ، ایک سوال، پردۂ خلوت، عورت، آزادیٔ نسواں، عورت کی حفاظت، عورت اور تعلیم اور عورت، نظم "عورت کی حفاظت" میں مرد کو عورت کا نگہبان قرار دیا گیا ہے۔ یہ ایک زندہ حقیقت ہے کہ مرد عورت کا محافظ ہے اور جس قوم نے اس حقیقت سے آنکھیں چرائیں اس کا انجام یہ ہوا کہ وہ صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹ گئی۔ اقبال کہتے ہیں ؎

نے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی　　نسوانیت زن کا نگہبان ہے فقط مرد

اقبال عورت کے لئے پردہ کو ناگزیر سمجھتے ہیں۔ اُن کے نزدیک عورت کا ستر زوج یا خاک لحد ہے اور مرد کا ستر "حفظِ خویش از یار بد" ہے۔ یعنی مرد اپنے آپ کو بری صحبت سے محفوظ رکھے۔ عصرِ حاضر میں خواتین کی بے پردگی کا ذکر کرتے ہوئے اقبال اُن سے کہتے ہیں کہ وہ نورِ حق سے "جہانتابی" سیکھ لیں۔ اللہ تعالیٰ صدہا تجلیوں کے باوجود حجاب میں ہے ؎

ضمیرِ عصرِ حاضر بے نقاب است　　کشادش در نمودِ رنگ و آب است

جہانتابی ز نورِ حق بیاموز　　کہ اُو با صد تجلی در حجاب است

پردہ کے متعلق اقبال اپنے ایک لیکچر میں کہتے ہیں۔ "پردہ کے متعلق اسلام کے احکام صاف اور واضح ہیں۔ غض بصر کا حکم ہے اور وہ اس لئے کہ زندگی میں ایسے وقت بھی آتے ہیں جب عورت کو غیر محرم کے سامنے ہونا پڑتا ہے۔ خاص اس وقت کے لئے یہ حکم ہے۔ دیگر حالات کے لئے اور احکام ہیں۔ پردے کے سلسلے میں اسلام کا عام حکم عورت کو یہ ہے کہ وہ

اپنی زینت کو ظاہر نہ کرے۔ ''ضربِ کلیم'' کی نظم ''پردہ'' میں کہتے ہیں ؎

بہت رنگ بدلے سپہر بریں نے — خدایا یہ دنیا جہاں تھی وہیں ہے
تفاوت نہ دیکھا زن و شو میں میں نے — وہ خلوت نشین ہے یہ خلوت نشین ہے
ابھی تک ہے پردے میں اولادِ آدم — کسی کی خودی آشکارا نہیں ہے

ضربِ کلیم سے ہی یہ نظم بھی ملاحظہ کیجئے ؎

جوہر مرد عیاں ہوتا ہے بے منتِ غیر — غیر کے ہاتھ میں ہے جوہر عورت کی نمود
راز ہے اس کے تپِ غم کا یہ نکتۂ شوق — آتشیں لذتِ تخلیق سے ہے اس کا وجود
کھلتے جاتے ہیں اسی آگ سے اسرارِ حیات — گرم اسی آگ سے ہے معرکۂ بود و نبود
میں بھی مظلومیِ نسواں سے ہوں غمناک بہت — نہیں ممکن مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود

اقبال ایک بڑے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم فلسفی بھی ہیں۔ ان کے فلسفۂ خودی میں امومت کو بڑی اہمیت حاصل ہے کسی قوم کا بڑا سرمایہ اس کے تندرست، توانا، صالح اور نیک نوجوان ہوتے ہیں اور قوم کے افراد کی صحیح یا غلط تربیت میں ماں ایک نمایاں اور اہم رول ادا کرتی ہے۔ کوئی بھی شخص ایسا نہیں جس کی فطرت یا طبیعت میں اپنی ماں کی تربیت کے اثرات کارفرمانہ ہوں۔ چنانچہ ماں کی بہترین تربیت کے نتیجے میں تندرست، توانا اور صالح نوجوانوں کا پیدا ہونا یقینی ہے۔ اقبال کہتے ہیں ؎

قوم را سرمایہ اے صاحب نظر — نیست از نقد و قماش و سیم و زر
مال او رفرزند ہائے تندرست — تر دماغ و سخت کوش و چاق و چست
حافظ رمزِ اخوت مادراں — قوت قرآن و ملت مادراں

امومت سے متعلق ''رموزِ بے خودی'' کے یہ اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

از امومت گرم رفتارِ حیات — از امومت کشف اسرارِ حیات
از امومت پیچ و تابِ جوی ما — موج و گرداب و حبابِ جوی ما
۔۔۔دل ز آلام امومت کردہ خون — گرد چشمش حلقہ ہای نیلگوں

ملت از گیرد ز آغوش بدست — یک مسلمانِ غیور و حق پرست
ہستی ما محکم از آلامِ اوست — صبحِ ما عالم فروز از شامِ اوست
رشتۂ آئین حق زنجیر پاست — پاسِ فرمانِ جناب مصطفیٰ است
ورنہ گردِ تربتش گردید مے — سجدہ ہا برخاکِ او پاشید مے

علامہ اقبال نے مندرجہ بالا اشعار میں حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے رتبۂ عالی کا حد درجہ عقیدت مندی سے ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ انہوں نے امومت کا فرض نہایت عمدگی کے ساتھ ادا کر کے حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ جیسے حق پرست فرزندان پیدا کئے۔ علامہ نے خواتین کو امومت کا وہی معیار پیدا کرنے کی تلقین کی ہے۔ اُن کی نظر میں حضرت فاطمۃ الزہراؓ خواتین اسلام کے لئے اسوۂ کاملہ ہیں۔ آپؓ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ آپؓ رسولِ خداؐ کی صاحب زادی، شیرِ خدا حضرت علیؓ کی زوجۂ مکرمہ اور حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ کی والدہ ماجدہ ہیں۔

مریم از یک نسبت عیسیٰؑ عزیز — از سہ نسبت حضرتِ زہراؓ عزیز

حضرت فاطمۃ الزہراؓ نے اپنے بلند اخلاق اور اعلیٰ کردار و عمل سے اپنے گھر کی فضا کو اس قدر سازگار بنایا کہ اس میں شہیدِ کربلا جیسے مردِ حق کی پرورش و پرداخت ہوئی۔ اس فضا میں خدائے واحد کی بندگی، رسول پاکؐ کے احکامات کی بجا آوری، شریعت کی پابندی، شوہر کے تئیں ایثار اور وفاشعاری، اولاد کی صحیح تربیت، حاجت مندوں کی خدمت کے علاوہ متعدد عناصر کارفرما ہیں۔

آں یکے شمع شبستان حرم — حافظِ جمعیتِ خیر الامم
مزرع تسلیم را حاصل بتولؓ — مادراں را اسوۂ کامل بتولؓ
بہر محتاجے دلش آں گونہ سوخت — با یہودے چادرے خود را فروخت
آں ادب پروردۂ صبر و رضا — آسیا گرداں و لب قرآں سرا

اقبال نے خواتین کو حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی حیات طیبہ پر غور کرنے اور آپؓ کے نقشِ قدم

پر چلنے کی تلقین کی ہے۔ اُن کے نزدیک ''عورت کو اپنی انتہائی عظمت تک پہنچنے کے لئے فاطمہؓ کا بہترین نمونہ ہے''۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورت کا کام بچوں کی صحیح تربیت ہے اور یہی اُس کا اصل مقام ہے۔

نیک اگر بینی امومت رحمت است زانکہ اورا با نبوت نسبت است
شفقتِ او شفقتِ پیغمبر است سیرت اقوام را صورت گر است
از امومت پختہ تر تعمیر ما در خطِ سیمای او تقدیر ما
ہست اگر فرہنگ تو معنی رسی حرف اُمت نکتہ ہا دارد بسے
گفت آں مقصود حرف کن فکاں زیر پای اُمہات آمد جناں
ملت از تکریم ارحام است و بس ورنہ کارِ زندگی خام است و بس

از امومت گرم رفتارِ حیات از امومت کشفِ اسرارِ حیات

اُردو شاعری بالخصوص غزل کے سرمائے پر اگر چہ نظر دوڑائی جائے تو اس میں عورت کو زیادہ تر جمالیاتی نقطۂ نظر سے دیکھا گیا ہے اور اس کے حسن و جمال کے بیان میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے گئے ہیں۔ البتہ بعض شعراء کے یہاں عورت کی عظمت کا تصور ملتا ہے۔ مثال کے طور پر فراقؔ نے عورت کا تصور ہندومت کے مذہبی Scriptures سے اخذ کیا ہے۔ فراقؔ کے یہاں عورت ماں ہے، بہن ہے، بیوی ہے، بیٹی ہے، گویا انہوں نے عورت کا ایک ہمہ گیر تصور پیش کیا ہے۔ اسی طرح جاں نثار اخترؔ اور کئی دوسرے شعراء کے یہاں عورت کا گھر آنگن والا تصور ملتا ہے جو عملی یا خانگی زندگی کے دارۂ کار سے خارج نہیں۔ لیکن ایسے شعراء کی بھی کمی نہیں جن کے یہاں عورت محض تفنن طبع کا ذریعہ ہے اور بس۔ اقبال کے یہاں عورت کی اہمیت کا اعتراف اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اسکی کہ ہر شرف ہے اسی درج کا درِ مکنوں
مکالمات فلاطون نہ لکھ سکی لیکن اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ فلاطون

مصنفہ کی چند مطبوعات

اقبال اور اُن کے معاصر شعراء اور ادباء

مطالعہء مثنوی اسرار خودی

فاضلِ کاشمیری۔ شخص اور شاعر

فراق گورکھپوری۔ حیات شخصیت اور کارنامے

گلدستہء فاضلِ

پبلشر

فاضلِ پبلی کیشنز، سرینگر کشمیر